متاعِ کلیم

متاعِ کلیم

کلیم احمد آبادی

متاعِ کلیم

از :- کلیم احمد آبادی

تعداد .... بارہ سو

طباعت :- یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ٹھاکر دوار ۲۳ نوروجی اسٹریٹ بمبئی ۲

ٹائیٹل آرٹ .... عنیض

کتابت .... خواجہ نورالدین آزاد

قیمت چار روپے

ناشر

کلیم بکڈپو
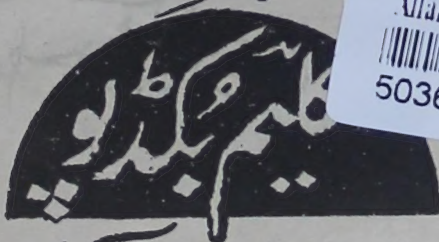
خاص بازار احمد آباد

پرنٹر پبلشر جمیل کلیمی نے یونیورسل لیتھو پریس ۲۳ نوروجی اسٹریٹ بمبئی ۲ سے چھپوا کر کلیم بکڈپو خاص بازار احمد آباد سے شائع کیا

انتساب

احمد آباد کے اُن اہلِ ذوق عوام کے نام!

جنھوں نے میری جشن جوبلی منا کر

گویا ایک ذرّہ کو مہِ کامل بنا دیا

اور

اپنے جواں سال فرزند

وقار (کلیمی) مرحوم کے نام

جو عینِ جوانی میں مجھ بوڑھے کو

کربناک داغِ جدائی دے گیا

کلیم احمد آبادی

پیش لفظ

از ـــــ حبیب الرحمٰن غزنوی

دُنیا میں عموماً دو قسم کے افراد پائے جاتے ہیں، کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو تاریخ کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور اس سے کافی حد تک متاثر بھی ہوتے ہیں، جبکہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی زندگی کا مطالعہ خود تاریخ کرتی ہے اور پھر انہی کے حالات و واقعات سے ترتیب پاتی ہے۔ پہلی قسم کے افراد میں تو ہم اور آپ سبھی شامل ہیں۔ ہماری اجتماعی زندگی ممکن ہے تاریخ پر اثر انداز ہوتی ہو، مگر انفرادی حیثیت سے ہمارا کوئی وزن نہیں ہوتا اور پھر ہم میں کئی ایک افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو نظم کائنات میں حشو و زوائد سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ البتہ دوسری قسم کے افراد کی قدر و قیمت اس لئے زیادہ لگائی جاتی ہے کہ وہ اپنے عزائم، مقاصد اور کارناموں کے ذریعہ تاریخ پر گہرے نقوش ثبت کر سکتے ہیں۔

دُنیوی زندگی کے مختلف شعبوں میں بس جانے والی شخصیتیں اپنی اپنی طبعی اُفتاد کے اعتبار سے مختلف شعبوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہیں اور اسی شعبۂ زندگی کی زلف برہم کو سنوارنا انکا مقصدِ حیات قرار پاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی کے حالات و واقعات کے ساتھ اُس عہد کی پوری تاریخ لپٹی رہتی ہے۔ یہی لوگ تاریخ کو بناتے ہیں اور انہی کے کارناموں سے تاریخ تشکیل پاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے افراد میں کچھ لوگ ایسے خوش نصیب بھی ہوتے جنہیں صفحۂ ہستی پر اُبھرنے کا

پورا پورا موقع ملتا ہے اور شہرت نیک نامی کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اُبھرنے کے مواقع نصیب نہیں ہوتے یا وہ اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے شہرت ناموری کے تمام ذرائع و وسائل سے بے اعتنائی برتنے کے باعث بامِ عروج پر نمایاں نہیں ہو سکتے

کلیم احمد آبادی کا شمار اسی قسم کے افراد میں ہو سکتا ہے۔ باوجود اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور خدمات کے وہ کبھی پردۂ گمنامی سے باہر نہ آئے۔ لَنْ تَرَانِیْ کے اسرار و غوامض میں اسقدر منہمک رہے کہ تجلّیٔ طور بھی ان کے حق میں بے اثر ثابت ہوئی۔ فقیرانہ بود و باش اور قلندرانہ طور و طریق نے انہیں دنیوی تکلفات اور شہرت کے منصوبوں سے ہمیشہ دور ہی رکھا۔ وہ سنہ ۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ یعنی آج تک پورے ۸۷ سال بیت گئے وہ جہاں تھے وہیں رہے اور جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ ——! البتہ ان کا فن بتدریج ارتقائی منزلوں سے گذرتا ہوا کہاں سے کہاں تک جا پہنچا! اور عرصہ ہوا ان کی شاعری مجاز کی تمام سرحدوں سے گذر کر حقیقت کی سرسبز وادیوں میں خیمہ زن ہو چکی —— مگر کلیم کی ظاہری وضع قطع میں کوئی فرق نہ آیا، وہی انکسار، وہی تحمّل و بردباری، وہی عجز و نیاز، وہی بے تکلّفی اور سادہ لوحی۔ وہی توکّل اور وہی شان استغناء نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا۔

آپ کا نام عبدالکریم ہے اور کلیم تخلّص کرتے ہیں۔ قریش برادری کے فرد ہیں اور احمد آباد (گجرات) وطن ہے۔ آپ کا عہد طفلی ایک ایسے دور کا رہین منّت ہے جبکہ گجرات میں دینی یا دنیوی تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا معمولی نوشت و خواند کافی سمجھی جاتی تھی اور پھر کلیم صاحب کی برادری میں تو اسکی بھی چنداں ضرورت سمجھی نہ جاتی ہوگی۔ چنانچہ آپ نے ابتدائی دور میں اُردو، گجراتی کی معمولی تعلیم پائی تھی مگر والدہ کی آغوش شفقت سے محرومی اور والدِ مرحوم کے دوسری شادی کر لینے کے بعد کلیم صاحب قطعی بے سہارا سے ہو گئے۔ گھر کا ماحول ناسازگار، محلّہ کے حالات نامساعد، مستقبل تاریک اور حال صبر آزما تھا اور غالباً یہی وہ دور ابتلاء تھا جو کلیم صاحب کی ذہنی تعمیر میں سنگِ بنیاد ثابت ہوا، کیونکہ کسمپرسی کا عالم، افلاس اور تنگ دستی کے حوصلہ شکن مصائب انسان کے اذہان و قلوب پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔

چنانچہ انہیں حالات نے کلیمؔ صاحب کی طبیعت میں سوز و گداز کی وہ لذّت پیدا کر دی جو انہیں کشاں کشاں اَدبِ شعر کی وادیوں میں لے گئی۔ جس غیر ادبی ماحول اور نامساعد حالات سے آپ دست و گریباں تھے اسمیں پاکیزہ افکار، لطیف جذبات و احساسات اور شاعرانہ مزاج کا پروان چڑھنا "جوئے شیر" کے مصداق تھا مگر "ہر کسے را بہرِ کارے ساختند" کے بمصداق شاعری کی نعمت قسمت میں قسّامِ ازل نے پہلے ہی سے لکھدی تھی چنانچہ وہی غیر ادبی بلکہ غیر اخلاقی ماحول مع اپنی تمام مکروہات کے کلیمؔ صاحب کی فنکارانہ ادبی تعمیر میں اینٹ گارا ثابت ہوا۔ انہوں نے جو کچھ اپنے گردو پیش دیکھا، اس کا تجزیہ کر کے صحیح نتائج اخذ کئے اور انہی نتائج کو شعر و سخن کی لڑیوں میں اسطرح پرویا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

احمد آباد

یوں تو تاریخ کے ہر دور میں علم و کمال کا مرکز اور علماء و فضلا کا مسکن رہا ہے۔ مگر پچھلی ایک صدی سے احمد آباد ——— بلکہ پورے پورے صوبۂ گجرات نے کتنی ہی مادّی ترقی کیوں نہ کی ہو ——— فنونِ لطیفہ ——— خصوصاً اردو شعر و ادب کے معاملہ میں گجرات کا ماحول چنداں حوصلہ افزا نہیں رہا۔ اساتذۂ فن کا قحط۔ علمی تحریکات کی کمی، ادبی اداروں کی قلت، اُردو پریس اور جرائد کا فقدان اور دُنیائے شعر و سخن کا جمود ——— ! ظاہر ہے کہ ان حالات میں ادب و شعر کو اپنا مقصد حیات بنا کر چلنے والوں کا کیا حشر ہوتا ہوگا اور پھر کلیمؔ ایسے غُربت زدہ اور زمانے کے ستائے ہوئے انسان کے لئے تو یہ راستہ کسی طرح حسبِ حال نہ تھا۔ مگر اسی زمانے میں آپ کی ملاقات عزیزؔ اٹاوی مرحوم سے ہوئی جو اُن دنوں احمد آباد میں کتابوں کی تجارت کرتے تھے۔ اور شعر و سخن کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ عزیزؔ مرحوم باعتبار فن مرزا غالبؔ رح کے سلسلہ سے تھے۔ اور وہ اس طرح کہ عزیزؔ کے اُستاد حضرت سہیلؔ سورتی، حضرت اعجازؔ بھڑوچی کے شاگرد تھے اور اعجازؔ صاحب شاگرد تھے حضرت رضوان علیخاں مرادآبادی کے اور وہ شاگرد تھے حضرت غالبؔ مرحوم کے۔ کلیمؔ صاحب نے اوّلین فرصت میں حضرت عزیزؔ اٹاوی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور چمنستانِ شعر و سخن کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب

دہلی میں حضرت داغ دہلوی اور لکھنؤ میں امیرو جلال کے غلغلے بلند تھے، عزیز مرحوم کی کتابوں کی دوکان کلیم صاحب کیلئے دارالمطالعہ ثابت ہوئی۔ کچھ عرصہ تک مطالعہ اور مشق سخن ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اس طرح گویا ۱۹۱۱ء سے کلیم صاحب نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا اور اصنافِ سخن میں غزل کو اپنا موضوع خاص بنایا۔

کلیم صاحب ۱۹۱۲ء میں بمبئی گئے اور متواتر چار سال تک وہیں رہے۔ اُستاد کی توجہ اور اصلاح نے شاگرد کی باطنی صلاحیتوں کو کافی ابھار دیا تھا۔ تھوڑی سی مشق نے شعر کے اسرار اور فن کے نشیب و فراز سمجھا دیئے تھے۔ بمبئی کی ادبی مجلسوں اور مشاعروں کی لگاتار شرکت کی وجہ سے کلیم صاحب نہ صرف یہ کہ وہاں کے ادبی حلقوں میں کافی مقبول و ہردلعزیز ہو چکے تھے بلکہ کافی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مگر باوجود ان امور کے آپ کی روش اور وضعداری جوں کی توں قائم تھی۔ وہی فقرو درویشی اور وہی توکل اور استغناء۔ عیش و طیش دونوں حالتوں میں مزاج و طبیعت کا دھارا ہمیشہ ایک ہی رُخ بہتا رہا۔ سادہ اور بے تکلف زندگی پہلے بھی پسند اور اب بھی مرغوبِ طبع رہی۔ پائے استقلال میں جنبش کے بیسیوں مقام آئے مگر اس پیکرِ عزم کی ہمت اور حوصلہ کو کوئی چیز متزلزل نہ کر سکی۔

بمبئی سے واپسی پر زندگی کا ایک نیا موڑ سامنے آیا۔ فقرو درویشی نے تصوف اور سلوک کی منزلیں دکھائیں اور طبیعت میں کچھ ایسا انقلاب آیا کہ مسلسل دس سال تک فکر سخن سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ لیکن اسی اثناء میں شاہجہانپور کے ایک طبیب حضرت شاد احمد آباد تشریف لائے اور یہاں اپنا مطب شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب احمد آباد کی دنیائے شعر و سخن پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی مگر حضرت شاد کے آتے ہی یہاں کی ادبی دُنیا ایک مرتبہ پھر انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھی۔ مشاعروں کی مجلسیں جمنے لگیں۔ جدید اور قدیم شعراء بزم آرائیوں میں مصروف ہو گئے اور پھر تو حالت یہاں تک جا پہنچی کہ پورا شہر شعر و ترنم سے گونج اٹھا۔ یہی وہ وقت تھا جب حضرت کلیم بھی پورے دس سال کے

بعد قفل سکوت توڑ کے میدانِ سخن میں در آئے۔ رنگ قدیم ترک کر کے رنگ جدید میں از سر نو فکرِ سخن کا آغاز کیا۔ آپ کا ابتدائی کلام ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک کا "جلوۂ یار" میرٹھ اور "ترقیٔ سخن" میں چھپتا رہا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ کلیم صاحب کی پرانی بیاض ایک ایسے حادثہ کی نذر ہو گئی جو ایک شاعر کے لئے مرگِ مفاجات سے کسی طرح کم نہیں کہا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز کلیم صاحب محلّہ کی مسجد میں نماز ادا کر کے لیٹ گئے اور صدری اُتار کر سرہانے رکھدی۔ اسی اثناء میں کسی بندۂ خدا کی نیت جو بدلی تو پوری صدری اُٹھا کر غائب ہو گیا۔ مسجد سے ملحقہ باغ میں پہونچ کر جب اس نے جیبیں ٹٹولیں تو چند بیڑیاں، دیا سلائی کی ڈبیہ، چار آنے نقد اور ایک قلمی بیاض کے سوا کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ ظاہر ہے چور کو ایسی معمولی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے خالی صدری تو وہیں ڈالدی، بیڑیاں، دیا سلائی اور چار آنے جیب میں رکھے اور آپ کی قلمی بیاض کو "ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ" کہتے ہوئے مسجد کے کنویں میں پھینکدیا۔ ایک روز اتفاقاً باغبان جب کنویں سے پانی نکال رہا تھا، اُس بیاض کے چند صفحات بھی باہر نکل آئے۔ مگر برسوں کی محنت ضائع ہو چکی تھی۔ اِس بیاض کے اِس طرح ضائع ہو جانے کا کلیم صاحب کو بیحد صدمہ تھا۔ اور وہ کافی عرصہ تک افسردہ اور ملول رہے تھے۔ اس مجموعہ میں جو کلام شائع ہو رہا ہے وہ بہت بعد کا ہے۔

کلیمؔ صاحب بیک وقت اُردو اور گجراتی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ البتہ آپ کو زیادہ پسند اُردو ہی ہے اور ساری زندگی اِسی زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ گجراتی غزلیں بھی آخری دور میں کہی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ہاں ـــــ یہ ضرور ہوا کہ گجراتی زبان کے شعر و ادب میں بھی کلیم صاحب کے لئے جگہ پیدا ہو گئی۔ ۱۹۵۱ء میں احمد آباد والوں نے اپنے اِس مایہ ناز صوفی منش شاعر کی جوبلی نہایت تزک و احتشام سے منائی۔ اُردو گجراتی کے تمام ادباء، شعراء، کالجوں کے پرنسپل اور پروفیسر، علمی و ادبی اداروں، اخبار نویسوں اور مل مالکوں نے متفقہ طور پر یہ جشن

منایا۔ مسلسل تین دن تک اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ پہلا اجلاس پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں محترم ندوی صاحب کے فاضلانہ خطبہ کے بعد پروفیسر ظہیر الدین مدنی، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم نے مقالے پیش کئے۔ مولانا سید ابو ظفر ندوی مرحوم کا ایک مقالہ بھی پیش کیا گیا تھا۔ اسی اجلاس میں باشندگان احمد آباد کی جانب سے مبلغ ایکہزار روپیہ کی تھیلی اور سپاسنامہ حضرتِ کلیم کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ دوسرے روز اُردو کا مشاعرہ تھا جسکی صدارت پروفیسر ڈار مرحوم نے کی تھی۔ اس مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد اور شکیل بدایونی کے علاوہ متعدد مقامی اور بیرونی شعراء نے حصّہ لیا تھا۔ تیسرے روز گجراتی اور ہندی مشاعرے کی نشست تھی جس کی صدارت احمد آباد کی ہر دلعزیز شخصیت شری چیتنیہ پرشاد دیوانجی نے کی۔ غرضکہ موجودہ دور میں جبکہ ملک کے مشاہیر شعراء کی جوبلیاں منانے کی کسی کو ہمّت نہیں ہوتی وہاں احمد آباد کے ہندو مسلم، پارسی اور عیسائی عوام و خواص نے مشترکہ طور پر اُردو کے ایک گوشہ نشیں اور گمنام شاعر کی اس عظیم الشان پیمانے پر جوبلی منائی جو احمد آباد کی علمی و ادبی تاریخ میں یادگار رہے گی۔

یوں تو کلیم صاحب کی زندگی کا معتد بہ حصّہ گوشہ نشینی میں ہی گذرا۔ مگر ۱۹۲۸ء میں آپ نے **کلیم بکڈپو** کے نام سے کتابوں کی ایک دوکان شروع کی تھی جو آگے چل کر مقامی شعراء اور اہلِ ذوق کا مرجع بنجانے کے باعث کچھ عرصہ تک کلیم صاحب کا زیادہ تر وقت اسی قسم کی علمی و ادبی دلچسپیوں میں کٹتا رہا۔ آپ کی اولاد میں اسوقت دو صاحبزادے اور صاحبزادیاں موجود ہیں اور ماشاء اللہ سبھی صاحبِ اولاد ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے جمیل کلیمی نے جب سے دوکان کا کاروبار سنبھال لیا ہے کلیم صاحب کو گویا تمام دنیوی مصروفیتوں سے نجات مل گئی ہے۔ دوکان سے فرصت پاکر اُنہوں نے مسجد کا گوشہ آباد کیا لیکن پچھلے دس سال سے تو وہ مکمل طور پر عزلت گزیں ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں صرف کلیم جوبلی کے پہلے اجلاس میں وہ تشریف لائے تھے اسکے علاوہ اُنہوں نے گھر سے باہر نکلنا تک قطعی بند کر دیا ہے۔ چند قدیم ملنے والے، چند دیرینہ احباب اکثر گھر پر

ہی آجاتے ہیں اور کلیم صاحب کا کچھ وقت ان کے ساتھ گفتگو میں کٹ جاتا ہے۔ اس کے ماسوا نہ کہیں جانا نہ آنا ــــ قویٰ مضمحل سے ہوتے جارہے ہیں۔ آنکھوں کی بینائی جواب دے چکی ہے۔ البتہ آواز بدستور دبنگ اور پاٹ دار ہے، اسمیں کوئی فرق نہیں آیا۔

کلیم صاحب نے پچھلے دور میں اُردو کی مشہور کتاب "طلسمِ ہوشربا" کو گجراتی میں منتقل کیا تھا جو شائع ہو کر کافی مقبول ہوئی تھی۔ دو سال قبل آپ کے نعتیہ کلام کا ایک مختصر سا مجموعہ "گلزارِ طیبہ" کے نام سے گجراتی رسم الخط میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے آغا حشر مرحوم کے چند ڈراموں کو بھی گجراتی کا لباس پہنا کر شائع کیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۷ سال کی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ آپ کے آخری دور کا کلام ہے جو بحمد اللہ آپ کی زندگی ہی میں شائع ہو رہا ہے۔

گجرات

مسیحِ اُردو

شعر و سخن کی شمع روشن رکھنے والی چند باقیات الصالحات ایسی ہستیوں میں **کلیم** صاحب صفِ اوّل کے فرد ہیں۔ آپ کا وجود مغتنمات سے ہے۔ خدا جانے اب تک اس شمع فروزاں سے کتنی ہی شمعیں روشن ہوئی ہونگی اور کتنی ہی بزمیں اور مجلسیں ان سے رونق پا چکی ہونگی۔ آج بھی اس میکدۂ سخن سے بادۂ عرفاں کے لبالب جام تقسیم ہو رہے ہیں۔ خدا کرے یہ میکدہ تا دیر آباد رہے۔

آبِ حیات آفس
احمد آباد ۱۸ ستمبر ۱۹۵۸ء

حسام الدین راشدی؟

از نجیب اشرف ندوی
پروفیسر اسماعیلیہ کالج (ڈائرکٹر آف اُردو ریسرچ انجمن اسلام ہائی اسکول بوری بندر بمبئی)

گجرات ہمیشہ سے علوم وفنون کا مرکز، تہذیب ثقافت کا مرجع اور صنعت و تجارت میں ایک بلند مقام کا مالک ہی نہیں رہا ہے بلکہ جہاں تک اُردو زبان وادب کی ابتداء و ارتقاء کا سوال ہے اس نے سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُردو سے پہلے جہاں اس زبان کو ہندی، ہندوی، ہندوستانی، ریختہ، دکنی، دہلوی، مورس وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا وہیں اس کا ایک پرانا نام گجری، گرجری اور بولی گجرات بھی رہا ہے۔

نویں اور دسویں صدی میں جبکہ شمالی ہند میں جہاں تک اُردو کے تخلیقی کارناموں کا سوال ہے سناٹا چھایا ہوا تھا گجرات کے شعراء وصوفیائے کرام نے یہاں شعر وادب کی مجلس سجا رکھی تھی، اس سلسلہ میں شیخ بہاء الدین باجن، قاضی محمود دریائی، علی جیوگام دھنی، خوب محمد چشتی وغیرہ کے نغمے گونج رہے تھے۔ پھر نشاۃ ثانیہ کا جب گیارہویں صدی میں آغاز ہوا تو جس شاعر کو سارے ہندوستان نے اپنا استاد مانا وہ اِسی گجرات کے دارالحکومت احمد آباد کا شاعر ولی تھا اور جو ایک بات لچرسی تھی وہی سب کے لئے باعثِ صد ناز و افتخار ثابت ہوئی۔

گجرات کی یہی کشش تھی جس نے آج سے ۲۹ سال قبل جب میں گجرات کالج میں نوکر ہو گیا تو مجھے اس طرف متوجہ کیا اور میں نے گجرات میں اُردو کی ترقی و توسیع کا مطالعہ شروع کیا۔ اسی سلسلے میں مجھے جہاں احمد آباد کے دوسرے شاعروں اور ادب دوست بزرگوں کے نام بتلائے گئے وہیں حضرت کلیم سے بھی ملنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ ایکدن میں اپنے ایک کرم فرما کے ساتھ

انکی کتابونکی دوکان پر حاضر ہوا، دکان پر ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ بیٹھے تھے انکے چہرہ پر خوش آئند سنجیدگی تھی۔ انکی آنکھوں میں مروت کی چمک تھی، ان کے پیشوائی کے انداز سے خلوص ٹپک رہا تھا اور انکی باتوں سے محبت کی بو آتی تھی۔ دیر تک گجرات کے شعراء کا تذکرہ رہا اور میں پہلی ہی ملاقات میں ان سے مانوس ہو گیا۔ اپنے تمام دیرینہ احتیاط و عزم کے باوجود مجھے اقرار کرنا پڑا کہ

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں

دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

اسکے بعد میں اُنسے اکثر ملتا رہا۔ اور جب انکو گجرات کے شاعروں سے میری دلچسپی کا حال معلوم ہوا تو ایک دن اُنہوں نے مجھے ایک بیاض عنایت فرمائی اسمیں تقریباً پچاس سے زیادہ گجرات کے قدیم شعراء کا کلام تھا۔ اتنا ہی اُنہوں نے بیاض کے آخری صفحہ پر اپنے ہاتھ سے یہ عبارت لکھی۔

"یہ کتاب جناب حضرت ندوی صاحب کو بخشش دی گئی"

راقم حقیر کلیم مورخہ یکم مارچ ۱۹۳۱ء

اور اس کے خاتمہ پر یہ شعر بھی لکھدیا:۔

زندگی کھیل ہے دنیا کے دکھانے کیلئے ؛ موت ہی منزلِ مقصود کو پانے کیلئے

انکی یہ بیاض میرے پاس انکے خلوص محبّت اور ادب دوستی کی دستاویز ہے اور انکی محبت اور وضعداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے جب احمد آباد والوں نے انکی ادبی خدمات کی اعتراف میں ایک جشن منعقد کیا تو اُسوقت بھی وہ مجھے نہیں بھولے اور اس مجلس کی صدارت کی عزّت مجھے بخشی۔

حضرت کلیم اُردو شاعری کے دبستانِ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں اور آج گجرات میں اگر وہ سب سے بڑے شاعر نہیں ہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے ایک بزرگ نے جو ان سے بہت قریب سے واقف اور بڑی حد تک انکے حبیبِ لبیب ہیں، انکے زندگی کے حالات لکھے ہیں اور ایک اعجاز رقم نے انکے کلام پر سیر حاصل بحث کی ہے مجھے بڑی خوشی ہے کہ اب جبکہ انکا کلام شائع ہو رہا ہے مجھے بھی یہ چند سطریں لکھنے کی عزت و مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ اب میری ان سے متعلق ایک اور صرف ایک دعا ہے کہ

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ـــ تاکہ گجرات کا طورِ معنی اس کلیم سے روشن رہے

۲ر دسمبر ۵۸ء نجیب اشرف ندوی

دیباچہ

اعجاز صدیقی

مدیر "شاعر" بمبئی

جو شخص اپنی طویل و مصروف ترین ادبی زندگی میں باوجودِ تمنّا اُردو، فارسی کے بعض عظیم شعراء کو انکی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پڑھنے کے لئے وقت نہ نکال سکا ہو اس کا گجرات کے ایک غیر معروف و گوشہ نشیں بزرگ شاعر کو مکملاً پڑھ لینا بڑی عجیب سی بات ہے مگر اسے کیا کیجئے کہ "متاعِ کلیم" کا مطالعہ ایک خوشگوار حادثہ بن گیا۔ میں اپنے ادبی و صحافتی تجربہ کی بناء پر اِدھر اُدھر سے پڑھ کر اس مجموعہ پر کچھ لکھ سکتا تھا لیکن شروع سے آخر تک مجھے اس کا ایک ایک شعر بلکہ یوں کہئے کہ ایک ایک لفظ دیکھنا پڑا ہے اور دورانِ مطالعہ میں جن متضاد کیفیتوں سے گزرا ہوں وہ صِرف میں ہی جانتا ہوں۔

یوں تو پچیس چھبیس سال سے میں حضرتِ کلیمؔ احمد آبادی سے واقف ہوں۔ ماہنامہ "شاعر" کے ابتدائی دَور میں غالباً دو چار بار اُن کا کلام بھی چھپا ــــ اور رسائل میں کون نہیں چھپتا؟ کہنے کی بات یہ ہے کہ اُسی زمانہ میں "شاعر" میں احمد آباد (گجرات) کے بعض ایسے شعرا بھی چھپے جن کا معیار دیکھ کر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ انکی رہبری میں "قصر الادب" کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ وہ شعراء حضرتِ کلیمؔ احمد آبادی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔

بعض باتیں اپنے وقت پر کافی اہم ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ انہیں اہمیت دی جائے اور یوں ہی صَرفِ نظر نہ کر دیا جائے۔ مگر اِس دنیا میں "سخت کافر" قسم کے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ مجھے آج رہ رہ کر اپنے اُس نہ ٹوٹنے والے کفر کا احساس ہو رہا ہے۔ ہم نے ماضی

میں نہ جانے کتنے تابندہ ستاروں سے نظریں چرائی ہیں، کتنے آفتاب و ماہتاب ہمارے سامنے سے گذر گئے لیکن ہم نے انکی تابناکی کو ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی۔ اُن کی حرارت اور توانائی کا کوئی احساس نہیں کیا!۔

بمبئی میں مستقلاً اقامت گزیں ہونے کے بعد اِدھر پانچ چھ سال میں کئی بار احمدآباد جانے کا اتفاق ہوا اور حضرتِ کلیمؔ سے بھی چند بار نیاز حاصل ہوا۔ اُن سے باتیں ہوئیں۔ اُنہوں نے اپنی محبّت کی بارش کی۔ غیر معمولی خلوص اور لگاؤ کا اظہار فرمایا، ادبی خدمات کی داد دی، روح میں اتر جانے والے جملے فرمائے اور ہر بار کچھ نہ کچھ اپنا نیا پُرانا کلام بھی سُنایا۔ وہ کئی سال سے اپنی آنکھوں کی بصارت کھو چکے ہیں لیکن میں نے انہیں بڑا دانا و بینا پایا۔ اِس بڑھاپے میں اُن کی آواز میں بلا کا درد اور اُن کے اشعار میں بے پناہ سوز و گداز کے ساتھ فکر کا بھی اندازہ ہوا۔ یہ تعلّی نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ پوری زندگی شعر و ادب کو پرکھنے ہی میں گذری ہے اور اب بلا تامل "ہے نہیں ہے" کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے اُنہیں شعر کی کسوٹی پر کندن ہی پایا۔ اور اُن کے صاحبزادے جمیلؔ کلیمی پر زور دیا کہ وہ بطور یادگار اپنے والدِ محترم کا مجموعۂ کلام چھپوادیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے علاقوں کے کہنہ مشق اور بزرگ شعراء کے کلام کو یادگار ہی کہا جاسکتا ہے۔ جہاں سے مشاہیر کی صف میں کوئی آنے کے قابل نہ ہو سکا۔

اب جبکہ کلیمؔ احمدآبادی کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا اہتمام و انتظام ہوا تو یکایک معلوم ہوا کہ اس کے انتخاب و نظرثانی کا قرعہ میرے ہی نام پڑا ہے اور اس بزرگ شاعر کو میری کم نظری پر اتنا اعتماد ہے کہ اصرار پر انکار کی کوئی معمولی سی چھاپ بھی نہیں پڑ سکتی۔ بات محبّت کی تھی اور زیادہ سے زیادہ "یادگار" کی، لیکن جب اُن کا مجموعۂ کلام مختلف اوقات میں لیکر بیٹھا تو اندازہ ہوا کہ اسکی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔ جوں جوں آگے بڑھا، ان کی محبّت پر انکی شاعرانہ عظمت کے نقوش اُبھرنے لگے اور وہ مجھے بہراعتبار ایک زندگی بخش تغزل کے خالق نظر آنے لگے۔ میں حیران رہ گیا کہ اتنے معیاری تغزل کے باوجود انہیں ہمارے اساتذۂ غزل کی صف میں شامل نہیں کیا گیا۔ جب خود میں نے اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھا تو تو ماضی کے اپنے اِس مفروضے پر کہ وہ بھی بعض دوسرے کہنہ مشق

شعراء کی طرح محض "قافیہ پیما" ہو نگے، بڑا انفعال و ملال ہوا۔ دراصل میری یا دوسرے ذمہ دار لوگوں کی ان کی شاعرانہ عظمت تک نارسائی خود ان کی گریز پائی کی بناء پر تھی وہ زندگی بھر گوشہ نشین رہے، اُن کے فطری ذوق نے اُن پر حجاباتِ شاعری تو وَا کر دیئے۔ لیکن وہ خود محمل نشیں ہی رہے۔ اِس پر مستزاد یہ ہے کہ انہیں کوئی مجنوں صفت بھی نہیں ملا۔ وہ سالہا سال سے اَپنے اس شعر کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔ ؎

خود کہتا ہوں، خود گاتا ہوں، وہ مستِ غزل ہوں
خود جھُومتی ہے میری تمنّا میرے آگے

مگر اب "متاعِ کلیم" کی اشاعت دوسروں کو بھی جھُومنے کا موقع دیگی۔ نقادانِ ادب اور صاحبانِ ذوق یہ جان سکیں گے کہ گجرات کی سرزمین نے بھی اُردو کا ایک پتیدہ دِل، سوز آشنا اور درد و غم کی ماہیّت کو سمجھنے والا پختہ کار شاعر پیدا کیا۔ جس نے اپنے ذوق و وجدان کے سہارے ایسے ایسے شعر کہے ؎

کیا آپ بولتے تھے دل کی شکستگی میں — ہر لحظہ اک سکوں تھا، ہر لمحہ اک تسلّی

ٹوٹا نہ کاروانِ محبّت کا سلسلہ — ہارے تھکے سب ایک ہی منزل میں آ گئے
اچھا ہوا کہ معرکۂ عشق میں کلیمؔ — ہر مدعی کے سامنے ہم مات کھا گئے

غم نتیجہ ہے خوشی کی انتہا کا اے کلیمؔ — دِل کی اک اک موج، موجِ شادمانی ہو تو کیا

دل مرکزِ جمال ہے، ہم مرکزِ صفات — دل کی نظر کہیں ہے، ہماری نظر کہیں

چلے تو موجِ محبّت سُبک رَوی سے چلے — یہ کیا کہ شورشِ بے اختیار بن جائے
کچھ اِس ادا سے شگفتہ ہوا ہے غنچۂ دِل — خزاں بھی آئے تو فصلِ بہار بن جائے
سحر دعا کیلئے ہے، دعا سحر کے لئے — کہو کلیمؔ سے، شب زندہ دار بن جائے

یہ مری دیوانگی ہے، یا مرا ذوقِ جنوں
کر رہا ہوں اپنی ہستی پر نظر تیرے بغیر
کاروانِ شوق کو تیری طلب ہے اے کلیم
نامکمل ہے ابھی عزمِ سفر تیرے بغیر

میری آوارہ طبیعت کی یہ حالت ہے کلیم
جو لبِ ساحل کھڑا ہو اور کہے ساحل کہاں

رگ رگ میں مرے بھر دی بیتابی و بے چینی
آرام سے بیٹھے ہیں لیکر وہ سکوں میرا

یہ حادثہ بھی نہیں مرگِ ناگہاں سے کم
جو دو دلوں کی محبت کا راز کھل جائے

مطلب یہ تھا کہ اور کسی کو خبر نہ ہو
دل کی پکار، دل کی زباں سے سنی گئی
آدابِ بزمِ ناز کی مجبوریاں نہ پوچھ
کہنے کی بات بھی نہ زباں سے کہی گئی

جس کو کہتے ہیں ہم نسیمِ سحر
وہ بھی ذوقِ دل و نظر نہ ہوئی
رات اور وہ بھی انتظار کی رات
دن تو نکلا، مگر سحر نہ ہوئی
وہ مری زندگی، خدا رکھے
درد ہو کر جو دردِ سر نہ ہوئی

گرم آنسو بہہ رہے ہیں اس طرح
لُو چلے جیسے کہیں برسات میں

مرے عشق کا مشغلہ بن چکی ہے
ترے شوخ جلووں کی بے اعتنائی

گلشن بھی جنوں ساز، بیاباں بھی جنوں ساز
ہر چیز یہاں کی ہے تماشائے آگے

ہر طرح مطمئن ہیں مگر اے شعورِ زیست
اک زخم خوردہ دل کی اذیت کہاں سے لائیں
ہاں سر تو کر لیا ہے محبت کا معرکہ
لیکن سرورِ ذوقِ ہزیمت کہاں سے لائیں

دعویٰ سوز و سازِ محبّت تو ہے مگر | پروانہ وار جلنے کی جرأت کہاں سے لائیں
غم ہو تو اک سکون، خوشی ہو تو اضطراب | ایسی جنوں نواز طبیعت کہاں سے لائیں

کچھ خبر بھی ہے تجھے او دلِ احساس طلب | زندگی نام اسی کا ہے کہ تڑپا کرنا
عام کارانِ محبّت کیلئے مشکل ہے | آرزوئے غمِ جانکاہ کا پیدا کرنا

کفر ہے مذہبِ اربابِ وفا میں اے دوست | دل سے احساسِ محبّت کا فنا ہو جانا

مرہمِ زخمِ جگر بھی ہے نشاطِ دل بھی | وہ محبّت جو محبّت کی نظر سے گذرے

آخر آخر خشک آنکھوں پر کلیمؔ | ایک تارا جگمگایا تو سہی

مکاں سے لامکاں تک سلسلہ ہے جلوہ گاہوں کا | ہے یہ بھی معجزہ اہلِ محبّت کی نگاہوں کا

بڑا اعزاز ہے خلوت نشینِ حسن ہونا بھی | عبادت ہے یہاں کا جاگنا بھی اور سونا بھی
کلیمؔ اس جلوہ گاہِ ناز کی وسعت کو کیا کہئے | تجلیّات سے خالی نہ پایا کوئی کونا بھی

"متاعِ کلیم" میں جہاں وارداتِ حسن و عشق اور احساسات و جذباتِ محبّت کی سچی تفسیریں موجود ہیں، وہیں ایسے اشعار بھی بکثرت مل جاتے ہیں جو فکر و تجربہ کے بغیر جنم نہیں لے سکتے۔ کلیمؔ احمد آبادی نے حیات و کائنات اور اس کے مسائل و کوائف پر بھی نظر ڈالی ہیں اور نہایت پختہ کاری کے ساتھ اپنے تاثرات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ اُن کلام سے وسعتِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ نئی باتیں نہ سہی، پھر بھی زندگی کے مشترکہ حقائق کو اُنہوں نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے طور پر سوچا ہے اور اپنے انداز میں اُن کا اظہار کیا ہے وہ اگر بہت زیادہ گہرائیوں میں نہیں پہنچے ہیں تو ایسا بھی نہیں کہ ان کے خیالات محض سطح

پر تیر رہے ہوں۔ انکی فکر کی صحت مندی اور گیرائی سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا پھر جس سادگی، سلاست اور بے ساختگی کے ساتھ اُنہوں نے یہ اشعار کہے ہیں وہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، ہم ان میں اک لطف محسوس کرتے ہیں۔ یہی ایک اچھے شاعر کی پہچان ہے کہ ہم اس کے کلام میں کھوجائیں۔ کھو نہ سکیں تو کم از کم ایک لذت ضرور محسوس کریں۔ اُن کے ذیل کے اشعار دل اور روح دونوں سے ٹکراتے ہیں۔

ہزار اُمیدوں کو لے کر آئے تھے اِس جہانِ کرم نما میں
یہ کیا بھی کہ زندگی کے چراغ جل کر بُجھا کریں گے

اب آپ ہی کہئے کہ وہ کیوں ہوش میں آئے
ملتی ہو جسے اپنی خبر بے خبری سے

اب وہ بھی ہُوا صرف نظاروں کی ہوس میں
آنکھوں میں جو کچھ نُور تھا اشکوں کی تری سے

مے تھی، نہ میکدہ، نہ کوئی مے فروش تھا
ہم تھے جہاں، وہ عالم کیفِ خموش تھا

جب منزلِ حیات پہ ڈالی گئی نظر
حیرت زدہ تھا وہ بھی جو تسکیں بدوش تھا

یہاں کی پرواز جذبِ سالم، یہاں کی پرواز عشق و مستی
یہ وہ فضا ہے کہ اس فضا میں ضرورتِ بال و پَر نہیں ہے

جنوں کی حد سے گذر گئی ہے حقیقتِ انتظار شاید
نگاہ اپنی جگہ ہے قائم خیال بھی منتشر نہیں ہے

عشق تمہید مرے سوز و گدازِ دل کی
حُسن اک شعلہ مرے دِل کے نہاں خانے کا

صبح کے انداز کچھ ہیں، شام کے انداز کچھ
کیا تغیّر خیز ہیں لیل و نہارِ زندگی

سیکڑوں راہیں نکلتی ہیں اسی اک راہ سے
سلسلہ در سلسلہ ہے رہگذارِ زندگی

جنوں تک ہی نہیں محدود منزل تیرے مستوں کی
اگر کچھ اور بڑھ جاتے تو پھر جانے کہاں جاتے

صد شکر کہ پُرزے پُرزے یہ دامان و گریباں ہو تو گیا
اس وحشت دل کے ہاتھوں کچھ تسکین کا ساماں ہو تو گیا

یہ مقامِ محویت بھی وہ مقام ہے کہ جس میں
نہ جبیں نہ سجدہ ریزی، نہ حرم، نہ آستانہ

پہچانے نگاہوں میں زندگی کی راہیں
احساں ہے یہ بھی تیرا اے گردشِ زمانہ

اے شمعِ ازل تو ہی بتا دے کہ یہ کیا ہے
مرتے بھی ہیں، جیتے بھی ہیں پروانے شب و روز

ہیں جلوۂ امروز ہی دل میں جلوۂ فردا
شاید مری ہستی سے ہیں بیگانے شب و روز

مقام جبر سے آگے نکل کے دیکھ ذرا
تو اپنی زیست میں پائے گا اختیار بہت

دماغ و دل کی یہ کوتاہیاں ہیں ورنہ کلیمؔ
ہیں غور و فکر کی دنیا میں شاہکار بہت

اے کلیم زندہ رکھ سوز و سازِ ہستی کو
گُلِ شگفتہ رہتا ہے خار کے بہانے سے

کبھی قریب تھی منزل کبھی تھی کوسوں دور
یہ حادثے بھی سرِ رہگذار گذرے ہیں

جہاں کے خاک نشینوں کو جانتا ہوں میں
یہ اپنے وقت کے پروردگار گذرے ہیں

ساحل پہ پہنچنا ہے یا ڈوب کے مرنا ہے
موجوں کے تھپیڑوں کو آوازہ دوں کیوں کر

یہ فریبِ راہ بھی کچھ آگہی سے کم نہیں
یعنی ہر افتاد اک منزل سہی، منزل کہاں

مقصود تعین ہے، تحمل ہے، تفکر
یہ زیست کہیں حد سے گذرنے کے لئے ہے

سُنتا ہوں کہ آگے ہیں کئی اور منازل
سمجھا تھا کہ منزل تو ٹھہرنے کے لئے ہے

بے وجہ نہیں جوش کے آثار نفس میں
سیلاب کوئی سر سے گذرنے کے لئے ہے

چلا جو شب کا مسافر تو اس ادا سے چلا
کہ جب رُکا تو درِ صبح رونما نہ ہوا

چلے چلو کہ ابھی صبح کی سیاہی ہے
سحر قریب ہے، تارہ کوئی ہوا نہ ہوا

آسمان و زمین کو دیکھ لیا
ہم تو قائل ہیں دل کی وسعت کے

غم سے بیگانہ کیوں رہوں میں کلیم
دن تو کٹ جائیں گے مصیبت کے

تیر کے ٹوٹے ٹکڑے بھی
وقت پہ بن جاتے ہیں تیر

جوہرِ ذاتی رنگ و بُو
گُل سے نہیں گُل کی توقیر

بزمِ ناز کے یہ آداب
تارِ نفس بھی ہے زنجیر

دل کو دیکھوں یا تجھ کو
ایک ہے دونوں کی تصویر

مسکرانا بھی بارِ خاطر ہے
زندگی موت ہے حیات کہاں

ہو تو سکتا ہے ہر دعا میں اثر
لیکن اے دل وہ پچھلی رات کہاں

رازِ ہستی کون سمجھاتا، مگر سمجھا دیا
صرف اک ٹوٹے ہوئے دل کی حقیقت نے مجھے

کتنا عجیب ہے یہ مرا ذوقِ آگہی
جو جانتا ہوں، وہ بھی نہیں جانتا ہوں میں

اک موج تھی کہ جانِ چمن بن کے رہ گئی
کتنی لطیف تر ہے نسیمِ بہار دیکھ

شاید وہ تیرے پہلو سے آواز دے تجھے
کوئی تری سُنے نہ سُنے تو پکار دیکھ

دنیا بھی ایک عرصۂ محشر سے کم نہیں
سب اپنی اپنی دھن میں ہیں معروفِ کار دیکھ

چھوڑا نہ ساتھ ذوقِ اسیری نے بعدِ مرگ
جب ہم چلے تو ساتھ ہی دام و قفس چلے

لالہ و گُل تو حسیں سے بھی حسیں تر ہیں مگر
دیکھنا یہ ہے کوئی خار حسیں ہے کہ نہیں

تیری دنیا، تری دنیا کے پرستاروں میں
کوئی دیوانۂ دل، خاک نشیں ہے کہ نہیں

یہ سرگذشتِ زخمِ جگر ہے کہ اے کلیم
کچھ پھول کھل رہے ہیں بہار و خزاں سے دور

اے آفتابِ حشر نہ یوں مسکرا کے دیکھ
یہ دیکھ آج کون ہے کس کی نگاہ میں

کیوں نہ غمِ حیات سے مقصدِ سوز و ساز لوں
نالہ بھی دلخراش لوں، آہ بھی دل گداز لوں

فیصلۂ حیات میں کس لئے یہ مجھ سے کہدیا
ذوقِ سر خودی نہ لوں، ذوقِ سرِ نیاز لوں

کاش حواس و ہوش کو فرصتِ بے خودی ملے
کاش شکستہ دل سے کچھ درسِ فنا نواز لوں

جانے وہ کیا تھے مشغلے ناز و نیازِ عشق کے
سطوتِ غزنوی کہے، بندگیِ ایاز لوں

جہاں آسودگی پاتا رہا ذوقِ جنوں برسوں
اُسی آئینہ میں دیکھا ہے تجھ کو جلوہ گر برسوں

جس کی نہ کوئی ابتدا، جس کی نہ کوئی انتہا
ایسے بھی کچھ مقام ہیں رہگذرِ نگاہ میں

چھیڑتی ہے مجھے آ آ کے مری آزادی
گو میں قیدی ہوں، مرے پاؤں میں زنجیر بھی ہے

ناصح تری نصیحتِ سادہ کو کیا کروں
تو فلسفی ہے اور نہ ستارہ شناس ہے

مرنے سے ہے گریز نہ جینے سے ہے گریز
میرے دلِ غیور کو ہر چیز راس ہے

تقدیرِ الٰہی ہے دراصل جنوں میرا
گھٹ جائے تو درویشی، بڑھ جائے تو شاہی ہے

پہچانتے ہیں ہم بھی دنیا کی نگاہوں کو
ہم نے بھی کلیم آخر دنیا سے نباہی ہے

اُس کاروانِ شوق کی سرگرمیاں نہ پوچھ
منزل سے مطمئن ہو جو منزل کئے بغیر

ہونگے نہ ختم حادثۂ دورِ زندگی
دیوانگی کو دل کے مقابل کئے بغیر

عمرِ رواں کے ساتھ ہوں سرگرمِ جستجو
مل جائیگا کہیں نہ کہیں زیست کا سراغ

خود خم و پیچ تجھے راہ کے بتلا دینگے
تیری ٹھوکر میں ترا سود و زیاں ہے کہ نہیں

جناب کلیم احمد آبادی نے ایک طویل عمر پائی ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی بھی ہمارے سامنے ہیں، انکا ماحول، انکی مشغولیتیں اور انکی شاعری کے مختلف ادوار، کوئی بھی چیز ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یقیناً انہیں وہ شاعرانہ ماحول نہیں ملا جو دوسرے اساتذہ نے پایا۔ وہ بیرونجات کے مشاعروں میں بھی نہیں گئے۔ اپنے دور کے اساتذہ سے بھی ان کا کوئی خاص رابطہ نہیں رہا۔ جس شاعر کا ماحول قدامت پسند ہو، جسے آگے بڑھنے کے لئے مؤثر ذرائع نصیب ہوئے ہوں، جس کی طرف ادبی دنیا نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو اور جسے اسکی عرق ریزیوں کی کوئی داد نہ ملی ہو۔ پھر بھی وہ نہایت خاموشی سے ایک طویل زمانہ تک فکر و فن میں ڈوبا رہے، یہ بڑی حیرت کی بات ہے اور اس سے زیادہ حیرت یہ کہ خود

پرانے لوگ نئی بات کو نہ سمجھینگے
یہ اپنی وضع کے ہوتے ہیں پائیدار بہت

کہنے کے باوجود انہوں نے نئی باتوں اور نئی تحریکوں میں کسی نہ کسی حد تک دلچسپی لی ہے۔ وہ نئے زمانے کے حالات و واقعات سے بے خبر نہیں ہے۔ اس مجموعہ میں ان کی آخری اور تازہ ترین غزل موجود ہے جو انہوں نے ۸ر ستمبر ۵۸ء کو کہی ہے۔ ایک اسی سال کا بوڑھا شاعر، جس میں قیامِ ہوش و حواس کو مشتبہ کہا جا سکتا ہے اسکی ذہنی قوتیں ہرگز اس قابل نہیں ہو سکتیں کہ وہ جدید فکر و نظر کو اشعار میں سمو سکے۔ لیکن ذیل کے تین شعر اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ کلیمؔ احمد آبادی کا احساس و شعور اب بھی بیدار ہے۔ وہ اس زمانے کا مطالعہ کر رہے ہیں اور تجزیوں میں مصروف ہیں

شام و سحر کی گردشِ تازہ کے شیفتہ | مستقبلِ حیات کی قیمت کہاں سے لائیں!
اُڑنے لگی فضاؤں میں خاکسترِ حیات | اب اس سے بڑھ کے اور صداقت کہاں سے لائیں!
یوں منہمک ہیں کارگہِ خیر و شر میں ہم | موت آئے بھی تو مرنے کی فرصت کہاں سے لائیں!

ان اشعار کے علاوہ بھی ان کے نئے اور پرانے کلام میں عصرِ نو کی کہیں کہیں جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ اسی لئے میں نے ان کے کلام کو متنوع اور صحت مند کہا ہے۔

ہم بھی وہی ہیں، شام وہی ہے، سحر وہی | لاکھ انقلاب دہر میں آنے کو آ گئے

سرد ہو سکتا نہیں سرگرم انساں کا لہو | حادثاتِ نَو بہ نَو ہیں زندگانی ہو تو کیا

منزل سے آگے ہے، ذوقِ منزل | اُڑنے لگے ہیں اربابِ جادہ

آنے کو بہاریں آتی تھیں لیکن ہم رنگِ خزاں ہو کر
اک دَور ترا بھی گلشن میں اے گردشِ دوراں ہو تو گیا

مزدور کو سہنا پڑتا ہے ہر حال میں بارِ مجبوری
تخریب کے پہلو ہی اکثر تعمیر کے حامل بنتے ہیں
اس چلتی پھرتی دنیا میں اک ایسا دَور بھی آتا ہے
اُس دور کے ناقص ذرّے بھی ذرّاتِ کامل بنتے ہیں

اُنکی انتہائی بزرگانہ اور محبت بھری اجازت سے محض اُنکی ضعیفی کی مجبوریوں کی بناپر زبان و فن کے نمایاں سہو کو بھی دیکھتا گیا ہوں، پھر بھی بعض ایسے اشعار میں نے دانستہ چھوڑ دئیے ہیں جن کی طرف خود موصوف نے اشارہ فرمایا ہے ؎

سیکڑوں کمزوریوں کو اے کلیمؔ ٭ دیکھ لیتا ہوں میں اپنی ذات میں

اور اُن کی ذات ان کے کلام سے الگ نہیں ہو سکتی۔ کمزوریاں سب کے یہاں ہوتی ہیں، خواہ کوئی کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ مجموعی طور پر کلام کس قدر معیار کا ہے۔ مجھے اُس تکلیف دہ حقیقت کیطرف بھی اشارہ کرنا ہے جسے خود حضرت کلیمؔ نے محسوس فرمایا ہے ؎

بُرے بھلے کی یہاں قید ہی نہیں ہے کلیمؔ
زمانہ جس کو اُچھالے، اُچھال سکتا ہے

مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنا یہ خیال اپنے ساتھ لیکر اِس دنیا سے رخصت نہ ہونگے۔ اُنہوں نے جو کچھ اپنے اس شعر میں کہا ہے وہ دنیائے ادب و شعر کی ایک دیرینہ سنّت سہی لیکن "متاعِ کلیم" کی اشاعت کے بعد وہ اپنی اِس آخری عمر میں یہ دیکھ سکیں گے کہ اَدبی دنیا میں ان کی قدر و منزلت ہوئی اور ان کا کلام ان کے لئے حیات بعدِ مرگ ثابت ہوگا۔

میں آج کے اساتذۂ شعر و سخن کی صف میں حضرت کلیمؔ احمدآبادی کو بہر اعتبار ایک نمایاں مقام دئے جانے کا مستحق سمجھتا ہوں اور شعر و ادب کی تاریخ مرتب کرنیوالوں سے میری درخواست ہے کہ وہ خطۂ گجرات کے اِس تنہا فطری و حقیقی بزرگ شاعر کو اپنے تذکروں میں ضرور جگہ دیں۔

میری مصروف زندگی نے حضرت کلیمؔ احمدآبادی کو سامنے لانے کی جو سعی و کاوش کی ہے وہ نہ صرف میرے ہی لئے وجہ مسرت ہے بلکہ ادبی دنیا بھی میری اِس تلاش اور خوشگوار پیش کش سے یقیناً مسرور ہوگی۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے لعل و گہر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں۔

(جمشید پور)

۲ ر اکتوبر ۵۸ء

کلیم احمد آبادی

آوارگانِ عشق کی فطرت کہاں سے لائیں
وہ سوز، وُہ خلش، وہ حرارت کہاں سے لائیں
مشکل پسند دِل کی طبیعت کہاں سے لائیں
ہر روز ایک تازہ قیامت کہاں سے لائیں
رَاہِ طلب میں رَنج ہے راحت کہاں سے لائیں
تھک تھک کے بیٹھ جانے کی عادت کہاں سے لائیں
ہر طرح مطمئن ہیں مگر اے شعورِ زیست
اک زخم خوُردہ دل کی اذیت کہاں سے لائیں
ہاں سَر تو کرلیا ہے محبّت کا معرکہ
لیکن سرُورِ ذوقِ ہزیمت کہاں سے لائیں
شام و سحر کی گردشِ تازہ کے شیفتہ
مستقبلِ حیات کی قیمت کہاں سے لائیں
الفاظ ٹوٹے پھوٹے مگر شعریت کے ساتھ
اِک ایسی عامیانہ فصاحت کہاں سے لائیں

اِتنا تو ہو کہ ذوقِ طلب خود پکار اُٹھے
دستِ دُعا اُٹھائیے وا ہے درِ قبول

سچ ہے **کلیم** لذّتِ کون و مکاں کے بعد
کرتا ہے کون سوزِ غمِ جاوداں قبول

ستمبر ۵۸ء

کیا کام دے گئی ہیں زمانے کی گردشیں
جذباتِ دِل اُبھرتے گئے ہر جفا کے بعد

کہتے ہیں اس کو زندگیٔ جاوداں **کلیم**
یادش بخیر ذکر ہو جس کا فنا کے بعد

ٹوٹ کر دل مُسکرایا تو سہی
کچُھ نہ کچھ آرام پایا تو سہی

کم نہیں یہ بھی کہ سازِ دہر پر
ہم نے اپنا گیت گایا تو سہی

دِل کے نالے بے اثر ٹھہرے تو کیا
خُفتہ بختوں کو جگایا تو سہی

کیا تھے ہم، کیا تھی ہماری زندگی
مر کے لیکن تجھ کو پایا تو سہی

میں نے اُس کے سامنے دل رکھ دیا
دیکھ کر وہ مُسکرایا تو سہی

لہر میں تھا آج دیوانہ ترا
کچھ مزا باتوں میں آیا تو سہی

آخر آخر خشک آنکھوں پر کلیم
ایک تارہ جگمگایا تو سہی

جون ۵۸ء

پروانے کچھ نادان نہ تھے بیکار کی جرأت کیوں کرتے
یہ شمع کے جلنے سے پہلے جل جانے کی رغبت کیوں کرتے

تنہائی انکی فطرت ہے، آزادی اِن کا شیوہ ہے
یہ بات نہ ہوتی تو طائر شاخوں پہ سکونت کیوں کرتے

اَے دوست بشر کی طینت میں اجزا ہی کچھ ایسے ہیں ورنہ
میں اُنسے محبّت کیوں کرتا، وہ مجھسے محبّت کیوں کرتے

گرتے بھی رہے اُٹھتے بھی رہے اُٹھ اُٹھ کے چلے چل چل کے رُکے
یہ راہِ طلب ہے اَے راہی، اِس راہ میں غفلت کیوں کرتے

جو کچھ بھی کیا وہ ہم نے کیا جو کچھ بھی ہوا وہ ہم سے ہوا
ہم کو تو شکایت خود سے ہے، دنیا سے شکایت کیوں کرتے

یہ موجِ حوادث کی جھونکے، یہ شورشِ برق و باد کلیمؔ
کشتی کا بچانا مشکل ہے ساحل سے رفاقت کیوں کرتے

اِترا رہی ہے کیوں مرے زخمِ کہن کی موج
شاید اُڑا کے لائی ہے کوئی چمن کی موج

خود آکے پوچھ لیتے ہیں وہ میرے دل کا حال
کتنا خلوص رکھتی ہے تخمین و ظن کی موج

ارزاں تو اِس قدر نہیں خونِ شہیدِ ناز
یہ سُرخیٔ چمن ہے کہ دار و رسن کی موج

اب تک کھلیں نہ اُن کے تبسم کی لرزشیں
جنبش لبوں پہ کھیلتی ہے یا دہن کی موج

انگڑائیوں کے ساتھ چمکتی تھیں بجلیاں
شاید وہ آپ بھول گئے بانکپن کی موج

اپنے لباس میں جیسے آسودگی ملے
وہ ناز آفریں مرے دیوانہ پن کی موج

رگ رگ سے اِک سرور ٹپکتا ہے اے کلیم
یہ دل کی موج ہے کہ شرابِ کہن کی موج!

مارچ ۱۹۵۸ء

انقلابِ دہر رُک رُک کر جواں بنتا گیا
جو سبک سر تھا وہی سنگِ گراں بنتا گیا

نغمۂ دل جب بڑھا آہ و فغاں بنتا گیا
آسماں اک اور زیرِ آسماں بنتا گیا

جانے کیا بھر دی ہیں اُس نے اِس چمن میں شوخیاں
جو بھی آیا وہ چمن کا رازداں بنتا گیا

ہر نفس کو اپنی منزل کا پتہ ملتا نہیں
جو جہاں ٹھہرا، وہیں اک کارواں بنتا گیا

سرد آہوں کا تصرّف ہو تو سوزِ دل کہاں
دل سے جو شعلہ اُٹھا وہ بھی دھواں بنتا گیا

بے سبب ہوتا نہیں جذباتِ دل کا ولولہ
جس نے سمجھا آپ اپنا رازداں بنتا گیا

کچھ بہاروں میں خزاں ہے کچھ خزاں میں ہے بہار
پھول مرجھائے تو غنچہ گلستاں بنتا گیا

آدمی کی اصلیت کو آدمی سمجھا نہیں
ایک قطرہ تھا جو بحرِ بیکراں بنتا گیا

ہم تو بیٹھے ہی رہے اپنی اسیری کو لئے
بننے والا کام بے وہم و گماں بنتا گیا

میر و غالب سے بڑھے تو حضرتِ اقبال تک
شغل شعر و شاعری کا جاوداں بنتا گیا

دہر میں یہ بھی تو ہیں قانونِ فطرت کے اصول
جو نظر سے گر گیا وہ داستاں بنتا گیا

برق کی سرگرمیاں تسلیم پھر بھی اے کلیم
بجلیاں گرتی رہیں اور آشیاں بنتا گیا

مارچ ۸۵ء

یہ بات دہر کی مجبوریوں سے ظاہر ہے
کہ زندگی بھی یہاں زندگی سے قاصر ہے

جو ہو رہا ہے زمانے کے خشک و تر میں وہ سب
ترے لئے ہے تری زندگی کی خاطر ہے

بہار و سبزہ و گل سے نہیں چمن کا وجود
چمن تو آپ ہی اپنا نظیر ناظر ہے

چلو، کچھ ایسی فضا میں کہ دل بہل جائے
یہاں تو مشغلۂ سوز و ساز نادر ہے

تمام جلوۂ سوز و گداز ہو جانا
کہ زندگی کا یہی راز ہے یہی سِر ہے

کلیمؔ گوہرِ مضموں کہاں سے لائے کوئی
نکل گیا جو قلم سے وہ شاذ و نادر ہے

فروری ۱۹۵۸ء

کیا خبر تھی حاصلِ صد زندگی بن جائیں گے
زخمِ دل لذت کشِ آزار ہو کر اور بھی

جو نہ آئے تھے کبھی وہ آگئے اچھا ہوا
جگمگائے گا چراغوں سے مرا گھر اور بھی

منظرِ شام و سحر ہی پر نہیں کچھ منحصر
اپنے اپنے وقت پر بنتے ہیں منظر اور بھی

کر گیا جو کام کرنا تھا ترا دستِ کرم
دردِ دل کا بڑھ گیا تسکین پا کر اور بھی

اے جنوں کم ہو چلا ہے ذوقِ دل کا اضطراب
کیا میں رکھ لوں دل کے اندر تیر و نشتر اور بھی

کیوں رہے دل میں خیالِ تنگیٔ داماں کلیمؔ
چشمِ تر پیدا تو کر سکتی ہے گوہر اور بھی

فروری ۱۹۵۰ء

دل اِس ادا سے تیری رہگذر کو تکتا ہے
نظر جھپکتی ہے اِس کی، نہ ہوش تھکتا ہے

کوئی رہا ہی نہیں تیری جلوہ گاہوں میں
وہاں ہجوم ہے ساغر جہاں کھنکتا ہے

گلوں کی شعلہ فشانی کو اور کیا کہیئے!
چمن میں آگ لگی ہے چمن دہکتا ہے

عجیب منزلِ سوز و گداز ہے راہی
ذرا سکون ملا ہے تو دل دھڑکتا ہے

کبھی وہ شاخ پہ بیٹھا نہ مطمئن ہو کر
کھلی فضا میں جو اڑتے ہوئے جھجکتا ہے

ہزار طرز کے جوہر ہیں آدمی میں کلیمؔ
خلوصِ دل ہو تو بے رنگ و بو مہکتا ہے

فروری ۵۸ء

فنا نواز کوئی خیر و شر نہیں رکھتا
بجز حضوریِ دل کچھ خبر نہیں رکھتا

سحر کا نور تو مخصوص ہے سحر کے لئے
نظارہ شام کا لطفِ سحر نہیں رکھتا

سکھا دیئے ہیں کچھ آداب جذبِ الفت نے
میں رو رہا ہوں مگر آنکھ تر نہیں رکھتا

بلا کشانِ محبّت کے دل کو دل نہ کہو
یہ وُہ مکاں ہے جو دیوار و در نہیں رکھتا

فرشتے دیکھ رہے ہیں مری نگاہوں کو
کہ یہ کلیمؔ نظر طُور پر نہیں رکھتا

۱۰ر دسمبر ۵۷ء

ہم ہو سکے نہ دہر کے جلووں سے بافراغ
جلتا ہے اک چراغ تو بجھتا ہے اک چراغ

جانے وُہ کیا نگاہ تھی جس کے سُرور نے
بادہ سے بھر دیا مرے دل کا تہی ایاغ

رکھتا ہوں میں بھی دولتِ دُنیا کہ میرے پاس
درہم ہیں دل کے داغ اشرفی جگر کے داغ

صیّاد کا گلہ نہ شکایاتِ بال و پر
اے ہم نفس ابھی تو قفس میں ہوں بافراغ

عمرِ رواں کے ساتھ ہوں سرگرمِ جُستجو
مل جائے گا کہیں نہ کہیں زیست کا سُراغ

اِک حرف سے نکلتے ہیں سَو حرف اے کلیمؔ
مصروفِ فکر رہتے اگر ہوں دل و دماغ

نومبر ۵۷ء

تیری تسکیں کا سبب کون و مکاں ہے کہ نہیں
روح پرور یہ جہانِ گذراں ہے کہ نہیں
دن کی ضو تابیاں تاریک فضائیں شب کی
پچھلی راتوں کے دھندلکے سی عیاں ہے کہ نہیں

نعرۂ دار و رسن، حادثۂ کون و مکاں
خفتہ جانوں کیلئے خواب گراں ہے کہ نہیں
خود خم و پیچ تجھے راہ کے بتلا دیں گے
تیری ٹھوکر میں ترا سود و زیاں ہے کہ نہیں

تیری زلفیں، ترا رخ، تیری جبیں، تیری نظر
یہ چمن آئینۂ دیدہ وراں ہے کہ نہیں۔

اِس نظر سے وہ مجھے دیکھتے رہتے ہیں کلیمؔ
گرم خوں، گرم نفس، گرم فغاں ہے کہ نہیں

نومبر ۵۷ء

نکھر نکھر کے بنے دلستاں گلاب کے پھول
حسین شوخ طراوت فشاں گلاب کے پھول

ہیں شاد کام سبھی اپنے اپنے مرکز پر
بہار و موجِ چمن، ٹہنیاں گلاب کے پھول

گلوں کا ہنسنا ہنسانا تو لازمی ہے مگر
کہاں وہ اُن کا تبسّم، کہاں گلاب کے پھول

بکھر بکھر کے بنے صحنِ گلستاں کی روش
سمٹ سمٹ کے بنی کہکشاں گلاب کے پھول

تمہاری شوخ نگاہوں کی شوخیوں کا نکھار
وہاں شفق کے دھندلکے، یہاں گلاب کے پھول

شعاعِ مہر سے ٹوٹا طلسم شبنم کا
کہ لے رہے ہیں سب انگڑائیاں گلاب کے پھول

نرالے شعر، نئی بندشیں، نیا مضموں
ابھار دیتے ہیں طبعِ رواں گلاب کے پھول

کلیمؔ شاعرِ رنگیں بیاں کا گہوارہ
بہارِ حُسن کی سرمستیاں، گلاب کے پھول

اکتوبر ۱۹۵۷ء

زندگی کیا چیز ہے سمجھا گئی موجِ طرب
اِک ترانہ اپنی دُھن میں گا گئی موجِ طرب

لمحہ لمحہ زلیست کا گزرا ہُوا یاد آ گیا
عمرِ رفتہ کو مری دُہرا گئی موجِ طرب

چونک اُٹھا ذرّہ ذرّہ، غنچہ غنچہ، پھول پھول
بے تحاشہ جب چمن میں آ گئی موجِ طرب

بھولنے والے ذرا اپنی ادائیں یاد کر
وہ ادا کیا تھی کہ جو لہرا گئی موجِ طرب

دَور اک ایسا بھی آیا چند لمحوں کے لئے
آئی، لیکن، آ کے پلٹا کھا گئی موجِ طرب

سادہ سادہ زندگی میں سادہ سادہ تھی بہار
میری اِس سادہ روِش پر چھا گئی موجِ طرب

پہلے آتی تھی مگر اب کیوں نہیں آتی کلیم
کیا ضعیفی سے مرے شرما گئی موجِ طرب

اکتوبر ۱۹۵۷ء

وُہ آرہے ہیں غمِ دل، اُنہیں بھی جا دینا
نہ ہو کچھ اور تو فرشِ نظر بچھا دینا
یہی بہت ہے کہ تاریک منزلوں میں بھی
چمک چمک کے ستاروں کا آسرا دینا
وُہی قریب سے آواز دے بھی سکتا ہے
کہ جس نے سیکھ لیا دُور سے صدا دینا
یہ کیا اصول ہے، انسانیت کے دیوانو!
جو دَب رہا ہو اُسے اور بھی دبا دینا
ہمارا کام یہی ہے کہ برق کی زد پر
نہ ہو جہاں، وہیں اِک آشیاں بنا دینا
کھلا ہے بابِ اجابت، بڑھی ہی موجِ کرم
روا ہے ایسے میں دستِ دُعا اٹھا دینا

کلیمؔ اہلِ چمن کیلئے بشارت ہے
نوائے گُل سے گلستاں کا مسکرا دینا

اکتوبر ۵۷ء

دل نہیں بھولا ابھی شب زندہ داروں کی روش
وہ نسیمِ صبح گاہی وہ بہاروں کی روش

دیکھنے والے ترے جلوے کہاں تک دیکھتے
سلسلہ در سلسلہ ہے جلوہ زاروں کی روش

ساغرِ گُل سے چھلکتی ہی رہے صہبائے ناز
مے فروشی ہے چمن میں خار زاروں کی روش

پھر نہیں رہتا چمن میں خار و گُل کا امتیاز
پھیر دیتی ہے صبا جب شاخساروں کی روش

تیز خاروں کی نگاہیں، غنچہ و گُل سوگوار
پائی جاتی ہے یہاں بھی بیقراروں کی روش

بات کرتے ہیں مگر سہمے ہوئے ڈرتے ہوئے
کس قدر سادہ ہے اے دل خاکساروں کی روش

مرنا جینا اس چمن میں اک تماشا ہی کلیمؔ
کیا نہیں معلوم تجھکو سبزہ زاروں کی روش

۲۷ اکتوبر ۵۷ء

جلوہ گردشتِ محبت کی زمیں ہے کہ نہیں
سنگریزہ کوئی تاروں کے قریں ہے کہ نہیں

کس کو آواز دوں مَیں کِسکو پکاروں اید وست
میری آواز ہیں تو جلوہ گزیں ہے کہ نہیں؟

اور کیا ہو گی ترے سوختہ جانوں کی روش؟
خشک دل، خشک دہن، خشک جبیں ہے کہ نہیں

لالہ و گل تو حسیں سے بھی حسیں تر ہیں مگر
دیکھنا یہ ہے کوئی خار حسیں ہے کہ نہیں

تیری دنیا، تری دُنیا کے پرستاروں میں
کوئی دیوانہ دل خاک نشیں ہے کہ نہیں

لا اُسے ڈھونڈ کے اب اے غمِ دورانِ جہاں
وہ کلیمِ جگر افگار کہیں ہے کہ نہیں؟

یکم اکتوبر ۶۰۵۷

ذی روح کی فطرت بھی تخلیق الٰہی ہے
آتش میں سمندر ہے گرداب میں ماہی ہے

تخریب کے پہلو میں تعمیر کی بنیادیں
تعمیر میں پیوستہ تخریب و تباہی ہے

انساں کو ہجومِ غم کر دیتا ہے ناکارہ
دراصل محبّت کی یہ تیز نگاہی ہے

تقدیرِ الٰہی ہے دراصل جنوں میرا
گھٹ جائے تو درویشی بڑھ جائے تو شاہی ہے

اب دیکھئے کیا گذرے اے ہمّتِ مردانہ
منزل کے تجسّس میں بھٹکا ہوا راہی ہے

پہچانتے ہیں ہم بھی دنیا کی نگاہوں کو
ہم نے بھی کلیم آخر دنیا سے نباہی ہے

اکتوبر ۵۷ء

اِک اِک رگِ حیات کو کامل کئے بغیر
وہ رہ سکے نہ دل کو مرے دل کئے بغیر
تسکین پا سکا نہ مرا اضطرابِ شوق
موجِ خوشی کو غم سے مبدّل کئے بغیر
پہنچا نہیں ہے کوئی تری جلوہ گاہ تک
پروازِ حسن و عشق کو حاصل کئے بغیر
آجا کہ تجھ کو دیکھ لیں بے شرط و بے حجاب
جلووں کو تیرے جلوۂ محفل کئے بغیر
اُس کاروانِ شوق کی سرگرمیاں نہ پوچھ
منزل سے مطمئن ہو جو منزل کئے بغیر
دیکھا کہ اور کوئی نہیں بزمِ ناز میں
پہنچے اسیر شورِ سلاسل کئے بغیر

ہوں گے نہ ختم حادثۂ دورِ زندگی
دیوانگی کو دل کے مقابل کئے بغیر
کوشش ہزار کیجئے لیکن سراغِ زیست
ملتا نہیں مشاہدۂ دل کئے بغیر
آگے قدم بڑھا تو دئیے ہیں مگر کلیمؔ
رہتے نہیں یہ حوصلے مشکل کئے بغیر

ستمبر ۵۷ء

شام ہی سے آج تو میں گوش برآواز ہوں
کیا خبر لائے نسیمِ صبح پردر دیکھئے

میرا نہیں، یہ میرے جنوں کا قیاس ہے
اِک چیز کچھ جھلکتی ہوئی دل کے پاس ہے
ناصح تری نصیحتِ سادہ کو کیا کروں؟
تو فلسفی ہے اور نہ ستارہ شناس ہے
مرنے سے ہے گریز نہ جینے سے ہے گریز
میرے دلِ غیور کو ہر چیز راس ہے
بے وجہہ تو نہیں ہیں مرے دل کی دھڑکنیں
اِک اصلیّت ہے اور بلند از قیاس ہے

باطن کا راز، راز ہی رہنے دے اے کلیمؔ
ظاہر تو فاخرہ ترے تن پر لباس ہے!

نومبر ۵۷ء

زورِ بازو بھی ہے اور سامنے نخچیر بھی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ ترکش میں کوئی تیر بھی ہے

کِس طرح عشقِ مجازی کو حقیقی کر لوں ؟
سامنے تُو ہے بغل میں تری تصویر بھی ہے

کچھ نہیں ہے ترے ہاتھوں میں لکیروں کے سِوا
بات ناصح کی ہے لیکن خطِ تقدیر بھی ہے

چھیڑتی ہے مجھے آ آ کے مری آزادی
گو میں قیدی ہوں مرے پاؤں میں زنجیر بھی ہے

میرے ہونے کا مرے ہوش کو احساس نہیں
ورنہ جو قطرۂ خوں ہے وہ شرر گیر بھی ہے

اہلِ دل کیلئے آزار ہے دُنیا کو مفید !
عقل اک ہوش ہے اور ہوش کی تعبیر بھی ہے

کوئی سمجھے کہ نہ سمجھے ترے اشعار کلیمؔ
زورِ غالبؔ بھی ہے اور دلکشیٔ میرؔ بھی ہے

ستمبر ۵۷ء

کونین کی ہر شئے ہے مہیّا مرے آگے
جُھکتی ہے نہیں بے وجہہ یہ دُنیا مرے آگے

کچھُ راز کھلے حُسنِ ازل کا مرے آگے
اے ذوقِ جُنوں کھینچ دے نقشہ مرے آگے

خُود کہتا ہُوں، خُود گاتا ہوں، وُہ مست غزل ہوں
خُود جُھومتی ہے میری تمنّا مرے آگے

غم دوست نہ بن غم کی حقیقت کو سمجھ لے
یہ زندہ دلی کا ہے تقاضا مرے آگے

مجنوں بھی نہ پہچان سکا اپنے جنُوں کو
بے ہوش نہ بن ہوش میں آ جا مرے آگے

پھر دیکھ کہ بیکار بھی با کار ہے ساقی
لوٹا ہُوا ساغر تو کوئی لا مرے آگے

گلشن بھی جُنوں سازِ بیاباں بھی جُنوں ساز
ہر چیز یہاں کی ہے تماشا مرے آگے

اِس طرح سے بکھرے ہیں مرے اشکِ ندامت
جیسے ہے کوئی نقشِ ثریّا مرے آگے

گفتارِ کلیمؔ اور ہے، افکارِ کلیمؔ اور
اِک گنجِ معانی ہے ادب کا مرے آگے

ستمبر ۶۰۵۷

○

ہمیں وہ ذرّہ روشن ہیں جن کے جلووں سے
کلیمؔ دونوں جہاں جگمگائے جاتے ہیں

سُرور و کیف ہے کچھ لذّتِ بقا تو نہیں
یہ ابتدا کی حقیقت ہے انتہا تو نہیں
ستارے تیز نگاہوں سے دیکھتے کیوں ہیں؟
مرا جنوں کوئی میرے لئے بلا تو نہیں؟
فریب کھائے نہ کیوں کر کسی کا سادہ دل
زمانہ ساز نگاہوں سے آشنا تو نہیں
کہیں گری تو ہے بجلی ذرا نظر کیجے!
کسی غریب کی پلٹی ہوئی دُعا تو نہیں
ہزار بار خزاں سے بہار ٹکرائی
چمن کا راز مگر آج تک کھلا تو نہیں
مزاجِ حُسن مکدّر ہے کیوں خُدا جانے
اِس آئینہ میں کوئی بال آگیا تو نہیں

ہجومِ ناز میں جلوہ فریبیوں کے سوا
کلیمؔ اور کوئی حادثہ ہُوا تو نہیں

۲۷ جنوری ۱۹۵۶ء

جلوہ حسن بتاں سے کیوں تغافل کیجئے
زندگی تاریک ہے کچھ ذکرِ کاکل کیجئے
جام و مینا کی طلب سے بے طلب ہو جایئے
جذب دل کی شورشوں کو ساغرِ مُل کیجئے
عشق کی سرگرمیوں نے کر دیا ہے بیقرار
اور جذبِ شوق کہتا ہے تحمل کیجئے

یہ طریقہ بھی طریقِ عارفانہ ہے کلیمؔ
اپنی بیتابانہ فطرت سے تغافل کیجئے

جنوری ۵۶ء

مقصودِ بشر کچھ نہیں جز وہم و گماں اور
ہر لحظہ بنا لیتا ہے یہ اپنا جہاں اور

صُوفی کا بیان اور ہے مُلّا کا بیاں اور
ڈرتا ہوں کہ بڑھ جائے نہ دل کا خفقاں اور

یہ ہو نہیں سکتا ہے کہ منزل پہ نہ پہنچیں
راہوں میں ابھی آئیں گے کچھ سنگِ گراں اور

یہ خاک نشیں بھی ہے یہی عرش نشیں بھی
آدم کا تصرّف ہے یہاں اور وہاں اور

کونین سے بیگانہ خود اپنے سے یگانہ
مومن کی فراست کا زماں اور مکاں اور

ہر لحظہ وہ آزاد ہیں ہر لحظہ گرفتار
ہے اہلِ محبّت کے لئے سود و زیاں اور

زندہ رہیں تا حشر کلیمؔ آپ کے اشعار
بھر دیجئے الفاظ میں اک روحِ رواں اور

مارچ ۵۶ء

ہم اپنے دل کی کیفیت کو دُہرانے کہاں جاتے
بہاروں کو خزاں کے ساتھ ٹکرانے کہاں جاتے

ترے رُخ کے تجلّی زار افسانے کہاں جاتے
نہ بنتے شمع کی صُورت تو پروانے کہاں جاتے

تمہارے دم قدم سے زینت کون و مکاں قائم
نہ ہوتے تُم تو پھر یہ آئینہ خانے کہاں جاتے

یہی تو ہیں کھنکتے ہیں جو محفل میں حسینوں کی
ہماری خاک سے بن بن کے پیمانے کہاں جاتے

جنُوں تک ہی نہیں محدُود منزل تیری مستوں کی
اگر کچھ اور بڑھ جاتے تو پھر جانے کہاں جاتے

طریقے ملک و ملّت کے سلیقے حسُنِ فطرت کے
جو دیوانے ادا کرتے تو فرزانے کہاں جاتے

کبھی ہم آذری ٹھہرے کبھی ٹھہرے براہیمی!
نہ ہوتے ہم تو دنیا کے صنم خانے کہاں جاتے

یہی تو ہے جہاں بانی یہی تو ہے جہاں بینی
کلیمؔ اپنے ہی سب ہوتے تو بیگانے کہاں جاتے

۳ اپریل ۵۶ء

یوں لگے لپٹے ہیں دامن سے ترے دامن گیر
جس طرح عکس ہو آئینۂ فطرت میں اسیر

واہ ری گردشِ تقدیر کہ یہ بھی نہ ہوُا
ہم نے چاہا تھا کہ ہو جائیں محبّت کے اسیر

کھُل گیا راز تو پھر رازِ محبّت کیا ہے
جیسے رکھدے کوئی ہاتھوں سے بنا کر تصویر

کہیں ایسا نہ ہو غیروں کی پرستش کر لیں
سامنے رکھ لیا کرتے ہیں ہم اپنی تصویر

ایک ٹوُٹی ہوئی دیوار تو بن جاتی ہے
دل، کہ جب ٹوٹ گیا پھر کہاں اُسکی تعمیر

دہر میں ہر کس و ناکس کا تصوّر نہ رہے
آؤ مل جُل کے نکالیں کوئی ایسی تدبیر

دیکھ مجُھ کو مرے ظاہر کی خرابی کو نہ دیکھ
یہ وہُ تخریب ہے ہو جاتی ہے جس کی تعمیر

گامزن ہو تو سہی عزم و ارادہ لے کر
راہ پر تجھ کو لگا لے گا ترے دل کا ضمیر

جب گذرتا ہے جنوں اپنے جنوں کی حد سے
پھر کھڑکتی نہیں پیروں میں جنوں کی زنجیر

شعریت کیلئے اک زہرِ ہلاہل ہے کلیمؔ
وہ تخیّل جو بنا تا رہا دامِ تزویر

۸ راپریل ۵۶ء

○

آستانِ حُسن ہے تسکینِ جان میرے لئے
اب کہاں جاؤں کہ سب کچھ ہے یہاں میرے لئے

مرنا جینا بھی مجھے تو عشق نے سکھلا دیا!
اور کیا؟ ہو گی حیاتِ جاوداں میرے لئے

گُل کی اِس میں کیا تقصیر
خار اگر ہوں دامن گیر

واہ رے ذوقِ جذبِ اسیر
حلقہ حلقہ ہے زنجیر

اپنے اشکوں کے گوہر
چُن لیتا ہے مرغِ اسیر

ہم بھی رکھتے ہیں ایسے چرخ
ایک نہ اک ترکش میں تیر

تیر کے ٹوٹے ٹکڑے بھی
وقت پہ بن جاتے ہیں تیر

وقت کے ہنگامے ابد و الست
ہوتے ہیں پتّھر کی لکیر

زندہ دل ہی رکھتا ہے
ظاہر و باطن ایک ضمیر

جوہرِ ذاتی رنگ و بُو
گُل سے نہیں گُل کی توقیر

ثابت ہوں یا سیّارے
راہِ طلب کے سب راہگیر

لائے کہاں سے کوئی کلیم
جدّتِ غالبؔ طرزِ میرؔ

فطرتِ آدم عالمگیر

ایک خیال اور سو تدبیر
بزمِ ناز کے یہ آداب!!
تارِ نفس بھی ہے زنجیر

دل کو دیکھوں یا تجھ کو؟
ایک ہے دونوں کی تصویر
نورِ سحر کے جلووں سے
کھیلتی ہے آہِ شب گیر

ہوش و خرد کی تفسیریں
دیوانوں کی ایک لکیر
ایک فریب اور سو جلوے
تنگ نہیں دامِ تزویر
کون سمجھ سکتا ہے کلیم
سوز و سازِ دل کا ضمیر

۱۰ / اپریل ۵۶ء

چمن سے جب بھی اسیرِ بہار گُذرے ہیں
"خوش آمدید" کے نغمے ہزار گذرے ہیں

وُہ بن کے برقِ نظر بار بار گذرے ہیں
جدھر بھی گُذرے ہیں بے اختیار گذرے ہیں

کبھی قریب بھی منزل، کبھی تھی کوسوں دُور
یہ حادثے بھی سرِ رہگذار گذرے ہیں

جہانِ نَو کے نشیب و فراز دیکھ لئے
جو خام کار تھے وُہ پختہ کار گذرے ہیں

کبھی تو رنج میں راحت، کبھی سُکون میں غم
کچھ اِس طرح مرے لیل و نہار گذرے ہیں

وُہ ایک جذبِ طلب تھا کہ ہوش تک نہ رہا
وَگرنہ راہ میں دھوکے ہزار گذرے ہیں

بڑھا نا ہاتھ گُلوں کی طرف سنبھل کے ذرا
یہ شُعلے وُہ ہیں جو آشفتہ کار گذرے ہیں

جہاں کے خاک نشینوں کو جانتا ہوں میں
یہ اپنے وقت کے پروردگار گذرے ہیں
اُسی کی زد پہ بنایا ہے آشیاں ہم نے
جدھر سے جھونکے سرِ شاخسار گذرے ہیں

فضائے دھر کی رنگینیاں نہ پوچھ کلیمؔ
کہ اِس چمن میں کئی نغمہ بار گذرے ہیں

۲۶ مئی ۵۶ء

○

اے نازِ کفر اب تو دکھا اپنی شوخیاں
مدّت ہوئی ہے نام خدا کا لئے ہوئے

شورشِ افکار میں جمعیّتِ کامل کہاں ؟
جس سے دل ہو مُطمئن اب وُہ سکونِ دل کہاں ؟

رُوح کی کیفیّتوں پر ہے اساسِ زندگی
رُوح جب بے کیف ہو پروازِ آب و گِل کہاں ؟

یہ فریبِ راہ بھی کچھ آگہی سے کم نہیں
یعنی ہر اُفتاد اک منزل سہی منزل کہاں

کہہ رہا ہوں کشتیٔ عمرِ رواں سے بار بار
بے خبر موجیں ہی موجیں ہیں یہاں ساحل کہاں

اِک نظر میں ساری دُنیا کی بہاریں کھینچ لوُں
لیکن اے جذبِ طلب وُہ روح پرور دل کہاں

اشکِ حسرت نوکِ مژگاں پر ڈھلک کر آ گئے
دیکھئے ٹھہرا ہُوا ہے کاروانِ دل کہاں ؟

میری آوارہ طبیعت کی یہ حالت ہے کلیمؔ
جو لبِ ساحل کھڑا ہو اور کہے ساحل کہاں !

۲۶ مئی ۵۶ ۶۰ء

وُہ بار بار زمانے سے کیوں نہ ٹکرائے
یہ کیا کہ بیخبر آیا ہے، بے خبر جائے

وُہ اک مقامِ وفا ہے جسے جنوں کہیے
کہ آشنا بھی جہاں آشناسی گھبرائے

بہارِ حُسن سبھی کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
یہ اِک فریبِ نگاہی ہے کیا کیا جائے

دل و جگر میں کچھ اتنی تو آگ پیدا کر
کہ تیری آہ کے شعلے سے برق تھرّائے

ستارہ بن کے مری آنکھ سے لہو ٹپکا
مُجھے یہ ڈر ہے کہیں آسماں نہ بل کھائے

وُہ شامِ غم کی سیاہی ہو یا ہو نورِ سحر
کوئی تو آکے مری زندگی پہ چھا جائے

جُنوں کی ہرزہ سرائی کا رازِ سربستہ
خدا کرے کہ نہ سمجھے کوئی، نہ سمجھائے

یہ حادثہ بھی نہیں مرگِ ناگہاں سی کم
جو دو دلوں کی محبّت کا راز کھُل جائے

اُسی کا نام حقیقت میں شعرِ فطرت ہے
درِ قبول سے جو بار بار ٹکرائے

کلیمؔ دردِ محبّت بھی اِک تماشہ ہے
نہ ہو یہ بات تو پھر زندگی کدھر جائے

۲ر جون ۵۶ء

بلند و پستِ حقیقت سے آشنا نہ ہُوا
وُہ دل کہ جس میں کوئی حرفِ مدّعا نہ ہُوا

وُہ زندہ دل تھا میں سہتا رہا غمِ دُنیا
اِسی میں جان دی لیکن گریز پا نہ ہُوا

چلا جو شب کا مسافر تو اِس ادا سے چلا
کہ جب رُکا، تو درِ صبح رُو نُما نہ ہُوا

تُمہیں بتاؤ کہ اس دل کا کیا کیا جائے
جو چوٹ کھا کے بھی چوٹوں سے آشنا نہ ہُوا

ستارے توڑ لئے ہم نے زُہد و تقویٰ کے
مگر جو حقِ عبادت تھا وُہ ادا نہ ہُوا

چلے چلو، کہ ابھی صُبح کی سیاہی ہے
سحر قریب ہے تارہ کوئی ہُوا نہ ہُوا

کلیمؔ دردِ محبّت سمجھ میں کیوں آئے
وُہی تو درد ہے جو دردِ لا دوا نہ ہُوا

۶ر جون ۱۹۵۶ء

جینے کے لئے اور نہ مرنے کیلئے ہے
یہ رختِ سفر وقت گذرنے کیلئے ہے
کشتی کو ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچالے
موجوں کا تصادم تو بکھرنے کیلئے ہے
مقصود تعیّن ہے تحمّل ہے، تفکّر
یہ زیست کہیں حد سے گذرنے کیلئے ہے
سُنتا ہُوں کہ آگے ہیں کئی اور منازل
سمجھا تھا کہ منزل تو ٹھہرنے کیلئے ہے
بے وجہ نہیں جوش کے آثار نَفَس میں
سیلاب کوئی سر سے گذرنے کیلئے ہے
منزل کی تڑپ ہے کہ ٹھہرنے نہیں دیتی
رہرو کا ارادہ تو ٹھہرنے کیلئے ہے
یہ ٹھیک تقاضہ ہے کلیمؔ اہلِ جہاں کا
جو کارِ نمایاں ہے وُہ کرنے کیلئے ہے

۶ جون ۵۶ء

اگر تو گشتۂ صبر و قرار بن جائے
تو ذرّہ ذرّہ تری یادگار بن جائے
یہ تیرے کیفِ نظر سے تو کچھ بعید نہیں
کہ شامِ زندگی صبحِ بہار بن جائے
چلے تو موجِ محبت سبک روی سی چلے
یہ کیا کہ شورشِ بے اختیار بن جائے
کچھ اس ادا سے شگفتہ ہوا ہی غنچۂ دل
خزاں بھی آئے تو فصلِ بہار بن جائے
وہ آدمی ہے مگر دور آدمیت سے
جو اپنی حرص و ہوا کا شکار بن جائے

سحر دعا کے لئے ہے دعا سحر کے لئے
کہو کلیم سے شب زندہ دار بن جائے

۱۱ر جون ۵۶ء

ہیں جمع طیورِ آوارہ، ہوتے ہیں غزلخواں ہونے دو
گلشن کے پریشاں نغموں کو کچھ اور پریشاں ہونے دو

تم کو تو اپنی کشتی کا نگراں ہر حال میں ہونا ہے
ہوتی ہیں اگر موجیں باہم خود دست و گریباں ہونے دو

یہ چاند ستاروں کی چالیں، کچھ رازِ حسن و عشق نہیں
چھپ جاتے ہیں چھپ جانے دو، ہوتے ہیں نمایاں ہونے دو

رکنے سے کسی کے رکتی ہیں سیلابِ محبت کی موجیں
جو راز کہ عریاں ہوتا ہے اُس راز کو عریاں ہونے دو

آدابِ جنوں یہ ہیں کہ ہم آدابِ جنوں کے ہیں نگراں
ہوتے ہیں اگر پرزے پرزے دامان و گریباں ہونے دو

خورشید کی ضوتابی تک ہیں یہ لالہ و گل کے افسانے
ہوتے ہیں کلیمؔ اربابِ چمن شادان و فرحاں ہونے دو

۲۲ جون ۵۶ء

وُہ اپنے ارادوں کو لیکر جب رونقِ محفل بنتے ہیں
اُس وقت نئی جان آتی ہے اُس وقت نئے دل بنتے ہیں
جذباتِ محبّت ہی اِک دِن جذبات کا حاصل بنتے ہیں
جس رُخ پر موجیں بڑھتی ہیں اُس رُخ پر ساحل بنتے ہیں
اِس چلتی پھرتی دُنیا میں ایک ایسا دَور بھی آتا ہے
اُس دَور کے ناقص ذرّے بھی ذرّات کامل بنتے ہیں
مزدُور کو سہنا پڑتا ہے ہر حال میں بارِ مجبُوری
تخریب کے پہلو ہی اکثر تعمیر کے حامل بنتے ہیں

شاعر کیلئے وُہ وقت کلیمؔ اِک مرگِ مُبرم ہوتا ہے
مضموں تو نظر کے سامنے ہوں اشعار بہ مشکل بنتے ہیں

۲۲ جون ۵۶ء

رنگین بہاروں کو سمجھا نہ جنوں میرا
ہر گُل کی لطافت میں پوشیدہ ہے خوں میرا

ہوتا ہی رہا ظاہر ہر چشمِ محبّت سے
کچھ رازِ دروں اُنکا کچھ رازِ دروں میرا

ٹکراتے ہو ٹکرادو دل اپنا مرے دل سے
بیکار نہ ٹھہرے گا ہر قطرۂ خوں میرا

رگ رگ میں مرے بھر دی بیتابی و بیچینی
آرام سے بیٹھے ہیں لے کر وہ سکوں میرا

پروازِ محبّت کی اللہ رے سرگرمی
افلاک کا ہر تارہ ہے صیدِ زبوں میرا

دیتا ہوں جگہ دل میں اک ایک اذیت کو
اِس دل کی اذیت میں پنہاں ہے سکوں میرا

کیا اور پلٹنا ہے پلٹی ہوئی دُنیا کو
رہ رہ کے ابھرتا ہے کیوں جذبِ سکوں میرا

کِس فکر میں رہتا ہے ہر وقت کلیم آخر
اِس فکر میں رہتا ہے ہر وقت جنوں میرا

۱۷ جولائی ۵۶ء

صدموں سے زمانے کے آہیں نہ بھروں کیونکر
پتھّر تو نہیں دل ہے ہو صبر سکوں کیونکر

جو عشق کا حاصل ہو جو حُسن کی منزل ہو
اُس درد کی لذّت سے محروم رہوں کیوں کر

ہر سانس میں جلنے کی آتی تو ہے بُو لیکن
دل ہے کہ جگر میرا معلوم کروں کیوں کر

جو اُن کی خوشی ہو گی وہ میری خوشی ہو گی
جس غم سے وہ راضی ہوں وہ غم نہ سہوں کیونکر

ساحل پہ پہنچنا ہے یا ڈوب کے مرنا ہے
موجوں کے تھپیڑوں کو آواز نہ دوں کیونکر

حق بات کے کہنے سے ڈرتا تو نہیں لیکن
جس راہ میں کانٹے ہوں وہ راہ چلوں کیونکر

مجبورِ محبّت ہوں اک بات تو بتلا دو
زندہ ہوں جیوں کیونکر موت آئے مروں کیونکر

سنجیدہ مزاجوں کی ہر بات ہے سنجیدہ
میں اپنی فراست سے بیگانہ رہوں کیونکر

۱۷ر جولائی ۱۹۵۶ء

دِل کی حسرت نِکل گئی شاید
شاخِ اُمیّد پھل گئی شاید
جنبشِ ناز کے اشارے پر
عمرِ رفتہ مچل گئی شاید
عشق میں ہم خوشی کو کیا کرتے؟
آہ بن کر نِکل گئی شاید
پھر اُبھارا ہے جذبِ فطرت نے
پھر جوانی مچل گئی شاید
جس کو دیکھو، وُہ اپنے بس میں نہیں
طرزِ دُنیا بدل گئی شاید
اب تو اُٹھیے کہ صبح ہوتی ہے
بیکراں رات ڈھل گئی شاید
آج ٹوٹا طلسمِ ضبط کلیمؔ
آہ، دل سے نکل گئی شاید!

۲۱ جولائی ۵۶ء

یہ چمن کا ذرّہ ذرّہ ہُوا کِس طرح فراہم
نہ یہ گُل کو آگہی ہے نہ یہ جانتی ہے شبنم
کہیں دن بہار کے ہیں کہیں ہے خزاں کا موسم
کہیں ہنس رہے ہیں غُنچے کہیں رو رہی ہے شبنم
ترے عشق نے ڈبویا ترے حُسن نے اُبھارا
مرے بس میں اب نہیں ہے مری زندگی کا عالم
ذرا اور جگمگا دے اِسے رُخ کی تابشوں سے
مرے دل کے آئینے میں ابھی روشنی ہے کم کم
مجُھے یاد ہے کہ ہمدم میں جہاں جہاں گیا ہُوں
مری رُوح نے تڑپ کر کیا میرا خیر مقدم
میں گرا تھا جس جگہ سے وہیں پھر تڑپ کے پہنچا
وُہ تھی ابتدائے آدم یہ ہے انتہائے آدم
ایک اِدھر سے موج آئی اک اُدھر سے موج آئی
تری زُلف کو سنوارا کہ وُہ ہو چکی تھی برہم

ترے عشق کی نظر میں ہے کوئی نگاہ والا
جو بکھر چکے ہیں تارے اُنہیں کر سکے فراہم
ترے پاس آ گئے بیٹھے ترے ساتھ دن گذارے
مگر اے کلیمؔ تجھ کو نہ سمجھ سکے کبھی ہم

۲۵ جولائی ۵۶ء

○

یہ بجلیاں تو خود اپنی چمک سے لرزاں ہیں
کریں گی کیا، وہ گُلِ خندہ زن سے ٹکرا کر

چلے جھونکے وُہ تیری رحمت کے
کِھل گئے پھُول سب محبّت کے
خار ہوں ذرّے ہوں کہ لالہ وُ گُل
آئینے ہیں یہ حُسنِ فطرت کے
آسمان و زمیں کو دیکھ لیا!
ہم تو قائل ہیں دل کی وسعت کے
لے اُڑا سب کے سب جنُوں میرا
جو طریقے تھے علم و حِکمت کے
تُو جو سمجھے تو سینکڑوں اِحساں
آدمی پر ہیں آدمیّت کے
دیکھئے ہنس رہے ہیں دیوانے
توڑ کر جام بزمِ عشرت کے
غم سے بیگانہ کیوں رہوں میں کلیمؔ
دِن تو کٹ جائیں گے مُصیبت کے!

۲۹ جولائی ۵۶ء

آتے بھی ہیں جاتے بھی ہیں مستانے شب و روز
رہتے ہیں کھُلے عشق کے میخانے شب و روز

میں جلوۂ امروز ہوں میں جلوۂ فردا
شاید مری ہستی سے ہیں بیگانے شب و روز

اے شمعِ ازل تُو ہی بتا دے کہ یہ کیا ہے؟
مرتے بھی ہیں، جلتے بھی ہیں پروانے شب و روز

گردش میں رہا کرتے ہیں، ہر حال ہیں لیکن
خود اپنی تگ و دَو سے ہیں انجانے شب و روز

ہم ہیں تو اندھیرے بھی ہیں، ہم ہیں تو اُجالے
ہم سے ہی چھلکتے ہیں یہ پیمانے شب و روز

۲۹ جولائی ۵۶ء

ذکر اُنہیں کا ہے مرے لمحات میں
جو سمو دیتے ہیں دِن کو رات میں

پھر چمک اُٹھے مرے جذبات میں
سینکڑوں جلوے اندھیری رات میں

کھو دیا کرتے ہیں اکثر سادہ دل
زندگی کا ماحصل شبہات میں

گرم آنسو بہ رہے ہیں اس طرح
لُو چلے جیسے کہیں برسات میں

جب نفی پر ہو مدارِ زندگی
ہے عبث چون وچرا اثبات میں

سوز ہو، یا ساز ہو، یا ہو خروش
کچھ تو ہونا چاہیئے جذبات میں

کیا کہوں، کیا ہے شعورِ زندگی
آئینہ ہے دل کے احساسات میں

پا رہا ہوں اُن کے جلوؤں کے نشاں
دشتِ غربت کی بھیانک رات میں

سیکڑوں کمزوریوں کو اے کلیم
[illegible]

کیا سکوں کا عالم ہے کیا سکوں کی بستی ہے
بیخودوں کی دنیا میں ہوش ہی نہ مستی ہے

اب کہاں سے لاؤں میں سربلندیاں یارب؟
حسن میں بھی پستی ہے عشق میں بھی پستی ہے

کوئی شئے نہیں بنتی میرے دل کا سرمایہ
میرے ہر ارادہ پر موت ہی کہ ہنستی ہے

اہلِ دل کو نسبت ہے کوہ و دشت و صحرا سے
جس طرف وہ جاتے ہیں زندگی برستی ہے

جس پہ میرا تکیہ ہے جس پہ ناز کرتا ہوں
وہ غمِ محبت ہے وہ سرورِ ہستی ہے

سربلند رہتا ہے پستیوں میں رہ کر بھی
یہ نہ ہو تو ناکارہ جذبِ خود پرستی ہے

اے کلیم دنیا بھی ہے لطیف تر اک شئے
اس نظر کو کیا کہیئے جس نظر میں پستی ہے

۱۳ ستمبر ۵۶ء

ہر خوشی دل کی معتبر نہ ہوئی
ہر نظر جلوۂ سحر نہ ہوئی
وہ مرے پاس آ کے بیٹھ گئے
یہ خبر ہے کہ کچھ خبر نہ ہوئی
جس خوشی پر اُچاٹ گیا تھا دل
اُس خوشی پر کبھی نظر نہ ہوئی
جس کو کہتے ہیں ہم نسیمِ سحر
وہ بھی ذوقِ دل و نظر نہ ہوئی
رات، اور وہ بھی انتظار کی رات
دن تو نکلا مگر سحر نہ ہوئی؟
جس تجلّی پہ ناز تھا ہم کو
وہ تجلّی بھی معتبر نہ ہوئی
وہ مری زندگی، خدا رکھے
درد ہو کر جو دردِ سر نہ ہوئی
اصل میں زندگی وہی ہے کلیم
مشکلوں سے جو سہل تر نہ ہوئی

۲۶ ستمبر ۵۶ء

ہم نے بھی اُن کا ساتھ دیا پیش وپس چلے
ٹکرا کے سازِ دل سے جو تارِ نفس چلے

انسانیت کے حال پہ رونا پڑا مجھے
دُنیا کو آگ دیدوں اگر میرا بس چلے

کتنے لطیف تر ہیں مقاماتِ محویت
جھپکی نہ تھی آنکھ اور ہزاروں برس چلے

اچھی نہیں ہے تیز روی راہِ عشق میں
دل سے کہو کہ اپنی روش ہر نفس چلے

چھوڑا نہ ساتھ ذوقِ اسیری نے بعدِ مرگ
جب ہم چلے تو ساتھ ہی دام و قفس چلے

گُل کو بہار راس نہ آئی کبھی کلیمؔ
کھِلنا ہی تھا چمن میں کہ دستِ ہوس چلے

۵ر اکتوبر ۱۹۵۶ء

یہ مُحبّت ہے مُحبّت سرگرانی ہو تو کیا
شدّتِ غم سے جگر کا خون پانی ہو تو کیا
روح بن کر میری رگ رگ میں سرایت کر گیا
ایسے دردِ دل کی کوئی ترجمانی ہو تو کیا

سرد ہو سکتا نہیں سرگرم انساں کا لہُو
حادثاتِ نو بہ نو میں زندگانی ہو تو کیا
اپنا جینا ایک دھوکا اپنا مرنا اِک فریب
زندگی سے زندگی کی ترجمانی ہو تو کیا

ہر طرح خوش خوش رہی ہے مُجھ سے میری زندگی
مہربانی ہو تو کیا نامہربانی ہو تو کیا

غم نتیجہ ہے خُوشی کی انتہا کا اے کلیمؔ
دل کی اِک اِک موج موجِ شادمانی ہو تو کیا

سکون کیسا، کہاں کی تسکیں، مزاج قائم اگر نہیں ہے
ہزار ساماں ہوں دلکشی کے مگر سکونِ نظر نہیں ہے

ہمیں تو وہم و گماں نے مارا، یقیں کسی بات پر نہیں ہے
یہ سوچتے ہیں وہ زندگی کیا کہ جس میں نفع و ضرر نہیں ہے

چمن کا ہر پھول اپنی اپنی روش پہ ہے اک جہانِ تازہ
ابھی بہاروں کا ہے تصرّف، ابھی خزاں کا اثر نہیں ہے

خرد کی مجبوریوں کا حاصل، مرے جنوں کی حقیقتیں ہیں
جہاں جنوں کا ہے دَور دَورہ، وہاں خرد کا گذر نہیں ہے

نفس کے تاروں کو چھیڑتا ہے کہ ساز پر نغمہ زن ہی مطرب
تڑپ رہے ہیں تڑپنے والے اُسے مگر کچھ خبر نہیں ہے

یہاں کی پرواز جذبِ سالم، یہاں کی پرواز عشق و مستی
یہ وہ فضا ہے کہ اس فضا میں ضرورتِ بال و پر نہیں ہے

جنوں کی حد سے گذر گئی ہے حقیقتِ انتظار شاید
نگاہ اپنی جگہ ہے قائم، خیال بھی منتشر نہیں ہے

جو ہو سکے تو کلیمؔ اک دن طلسمِ ہستی کو توڑ ہی دے
یہ ابتدا ابتدا رہے گی جب انتہا پر نظر نہیں ہے

دل کھنچ رہا ہے جذبۂ ذوقِ سُرور سے
آواز دے رہا ہے کوئی مجھکو دُور سے

کیا جانے کون جل گیا اور کون رہ گیا؟
اِک موج تو اُٹھی تھی ابھی برقِ طُور سے

جو کیفیت ازل میں تھی ہے آج بھی وُہی
ہم اُن کو دیکھ لیتے ہیں نزدیک دُور سے

چشمِ نظارہ ساز کی کیفیتیں نہ پُوچھ
آگاہ کر دیا مجھے ذوقِ سُرور سے

پھرتے ہیں مہر و ماہ فلک پر یہی یہی
کچھ فیضیاب ہیں تو فقط تیرے نُور سے

جلوے ہزار طرز کے دیکھے ہیں اے کلیم
کچھ قربِ خاص خاص سے کچھ دُور دُور سے

اب کہاں باقی وُہ ذوقِ سوز و سازِ آرزو
ختم کر دی زیست، بن کر بے نیازِ آرزو
ماہ و انجم گردشیں کر بھی چکے اپنی تمام
لیکے ہم بیٹھے رہے ناز و نیازِ آرزو
مٹ کے اک دن دیکھ اِس آغاز کے انجام کو
کروٹوں میں دہر کی پنہاں ہے رازِ آرزو
ہر چمن فرسُودہ فطرت پر ہے اِک تازہ چمن
آرزو خود ہے یہاں کونین سازِ آرزو
ساتھ دل کے کھو چکے سرمایۂ ذوقِ حیات
اب کہاں کیفیّتِ سوز و گدازِ آرزو

سچ تو یہ ہے دامنِ دستِ کرم میں اے کلیمؔ
چاہیئے وُسعت بقدرِ امتیازِ آرزو

آ، کہ ہے ذوقِ نظارا منتشر تیرے بغیر
بہکی بہکی سی ہے دُنیا کی نظر تیرے بغیر

تُو نہیں تو کائناتِ حسن ہے بے رنگ و بُو
تیرے جلوے بھی ہیں خود نامعتبر تیرے بغیر

اے کہ تیری ذات سے نشو و نمائے زندگی
زندگی ہے ورنہ بے برگ و ثمر تیرے بغیر

کون ہے جو زندگی کی گتھیاں سلجھا سکے
کارِ مشکل ہو تو کیوں ہو سہل تر تیرے بغیر

زندگی کی تلخیوں میں بھی ترا ذوقِ لطیف
کار فرما ہی رہا شام و سحر تیرے بغیر

یہ مری دیوانگی ہے یا مرا ذوقِ جنوں
کر رہا ہُوں اپنی ہستی پر نظر تیرے بغیر

کاروانِ شوق کو تیری طلب ہے اے کلیم!
نامکمل ہے ابھی عزمِ سفر تیرے بغیر!

کِس قدر اوج پہ یہ کارِ جہاں ہے ساقی
سُود بھی ہے تو بہ اندازِ زیاں ہے ساقی

نہ کوئی جادہ، نہ منزل، نہ سکوں ہے نہ ثبات
کیا یہی راہِ جہانِ گذراں ہے ساقی

جِس نے ہر لحظہ مرے دل کی نگہبانی کی
ڈھونڈتا ہُوں میں اُسی کو وُہ کہاں ہے ساقی

کِتنا بوسیدہ ہے یہ کاخِ بلندِ عالم
تیرے دیوانے کی اِک "ہُو" بھی گراں ہے ساقی

داغِ محرومی کو سینے سے لگا رکھا ہے
جانتا ہوں یہ محبّت کا نشاں ہے ساقی

کِس طرف جائے کہاں جائے کدھر جائے کلیمؔ
تیری دہلیز ہی سرمایۂ جاں ہے ساقی

مِری بے خودی کا ہمدم یہ ہے مختصر فسانہ
مُجھے ڈھونڈتا ہے اب تک مرے ہوش کا زمانہ

تُجھے کیا بتاؤں ناصح مری ہست و بود کیا ہے
یہ ازل کی ہے کہانی، یہ اَبد کا ہے فسانہ

اُسے عشق بھی نہ سمجھا اُسے حُسن بھی نہ جانا
جو ہے تجھ میں اور مجھ میں رہ و رسمِ غائبانہ

یہ مقامِ محویّت بھی وہ مقام ہے کہ جس میں
نہ جبیں، نہ سجدہ ریزی، نہ حرم، نہ آستانہ

ہیں کہیں خِرد کی باتیں، ہیں کہیں جُنوں کے چرچے
مری وحشتوں کا حاصِل نہ سمجھ سکا زمانہ

میں کلیمؔ کی غزل میں یہی دیکھتا ہوں اکثر
کہیں سوز و سازِ فطرت کہیں جذبِ عاشقانہ

یہ دل کہ دل ہی نہیں، آئینہ خصال بھی ہے
اسی میں جلوۂ ماضی، اِسی میں حال بھی ہے

تفکرّات کی دُنیا بھی ہے عجب دنیا
کہ بے خودی بھی ہے کچھ ہوش، کچھ خیال بھی ہے

معاملاتِ زمانہ کی سرگذشت نہ پوُچھ
یہ جانتا ہوں کہ جو سہل ہے محال بھی ہے

سُرورِ جاں نہ سمجھ زندگی کا ہر لمحہ
کہیں نشاط کا موجب، کہیں وبال بھی ہے

کلیمؔ جادۂ ہستی ابھی نہیں بھوُلا!
اُسے تو ساتھ گناہوں کے انفعال بھی ہے

جو لوگ آئے تھے منزل پہ مجھ کو پہنچانے
خبر نہیں کہ وُہ اپنے تھے یا تھے بیگانے

نہ موت کا کوئی ماتم نہ زندگی کی خوشی
اُٹھا دیئے ہیں یہ پردے بھی فکرِ فردا نے

ابھی نظر تھی مری اُن کے روئے زیبا پر
ابھی نظر کو مری کیا ہُوا خدا جانے

فنا کے بعد بھی مل جائے تو غنیمت ہے
وُہ زندگی کہ جسے چاہتے ہیں دیوانے

یہ حوصلہ کبھی ہوتا نہ یہ کشش ہوتی
فنا کا راز اگر جانتے نہ پروانے

مرے ندیم کہیں ایسا ہو بھی سکتا ہے
حرم کی راہ غلامِ حرم نہ پہچانے

کلیمؔ جادۂ فطرت سے ہٹ نہیں سکتے
اٹل ہیں اپنے ارادوں میں اُنکے دیوانے

جو تیری دید سے پائی تھی تازگی میں نے
وُہ سب خزاں کی روش پر بکھیر دی میں نے

وفا شعار نہ بنتا، نہ کوئی دُکھ پاتا!
خرید لی ہے زمانے سے دشمنی میں نے

زمانہ دیکھئے، کیا اپنی چال چلتا ہے
فنا کے رُخ پہ لگا دی ہے زندگی میں نے

پُکارتا ہُوں خُدا کو خُدا نہیں سُنتا؟
نہ جانے کس کے لئے کی ہے بندگی میں نے

مِرے خیال کی گنجائشوں کو دیکھ ذرا
کہ دشمنی بھی بنا لی ہے دوستی میں نے

فُروع سے ہے کلیمؔ اصلیّت کا اندازہ
سنبھل سنبھل کے بُہت اُن سے بات کی میں نے

لطیف تر ہے ترے حُسن کی بہار بہُت
مری نظر سے اُلجھتے رہے ہیں تار بہت
وُہ ایک سبزۂ بیگانہ پھر ہے بیگانہ
خزاں کے ساتھ رہا گو پسِ بہار بہُت
مرے نصیب کا تارہ بھی ٹوٹ کر نہ گرا
کیا تھا شب کی سیاہی میں انتظار بہت
وُہ پھُول ہر کسی دانا کے ہاتھ کیوں آئے
کہ جس کے گرد احاطہ کئے ہوں خار بہُت
ہے پھر بھی ہوش کی راہوں سے بیخبر ایدوست
یہ جانتا ہوں کہ ہے عقل ہوشیار بہُت
مقامِ جبر سے آگے نکل کے دیکھ ذرا
تو اپنی زیست میں پائیگا اختیار بہت
پُرانے لوگ نئی بات کو نہ سمجھیں گے
یہ اپنی وضع کے ہوتے ہیں پائدار بہت
دماغ و دل کی یہ کوتاہیاں ہیں ورنہ کلیم
ہیں غور و فکر کی دُنیا میں شاہکار بہُت

خاتمہ ہے ہر شئے کا اِک نہ اِک بہانے سے
برق کیوں تڑپتی ہے دُور آشیانے سے

درد کا کرم پایا غم نے آشنائی کی !
زندگی ملی تازہ، سختیاں اُٹھانے سے

بے طلب ہے دل میرا کیوں طلب بڑھاؤں میں
بار بار ٹکرائی زندگی زمانے سے

عشق ہے تو سب کچھ ہے حُسن ہی تو سب کچھ ہے
مل گیا جو ملنا تھا تیرے آستانے سے

دل کی سوزشیں ہمدم، کِس غضب کی ہوتی ہیں
خُود بخود بھڑک اُٹھی، آگ آشیانے سے

درد میں کسک بھی تھی روح میں تڑپ بھی تھی
مِٹ گئی وُہ کیفیت بے خودی کے آنے سے

ایک ایک تنکا ہے برقِ سوز و آتشناک
بجلیاں برستی ہیں میرے آشیانے سے

اے کلیمؔ زندہ رکھ سوز و سازِ ہستی کو
گل شگفتہ رہتا ہے خار کے بہانے سے

منزل بہ منزل جادہ بہ جادہ
چلنا ہے اے دل کیا ہے ارادہ؟
کتنی عجب ہیں یہ دل کی راہیں
آسانیاں کم، مشکل زیادہ
میرے جہانِ پُرکیف میں ہے
ہر چیز مستی، ہر چیز بادہ
ہر ابتدا میں ہر انتہا میں
اُس کی مشیت، اُس کا ارادہ

منزل سے آگے ہے ذوقِ منزل
اُڑنے لگے ہیں اربابِ جادہ

وقف کردی دین و دنیا کی خوشی میرے لئے
اِک متاعِ بے بہا ہے زندگی میرے لئے

اہلِ دُنیا کو مبارک ارتقائے عقل و ہوش
عین رحمت ہے مری دیوانگی میرے لئے

میرے جذبِ شوق کی سرمستیاں شام و سحر
لائی ہیں کیا کیا نویدِ سرمدی میرے لئے

کیا زمانے کا تغیّر اور کیسا اِنقلاب
میری دُنیا تو وہی دُنیا رہی میرے لئے

اپنے دل کو دل نہ سمجھا ہوں نہ سمجھونگا کبھی
قہر ہے احساسِ دل کی آگہی میرے لئے

دل تو لیتا ہوں مگر اب دل نہیں ملتا کلیمؔ
رہ گئی ہے صرف رسمِ دوستی میرے لئے

کیوں نظر ہو اِدھر اُدھر میری
میری فطرت تمام تر میری

کچھ خبر ہے تو بیخودی کو ہے
ہوش کو کچھ نہیں خبر میری

وہ تو اپنی خبر میں خود گم ہیں
کیا خبر لیں دل و جگر میری

کوئی دھوکا نہیں فریب نہیں
جوہرِ حُسن ہے نظر میری

کیا حقیقت ہے اور کیا ہے مجاز
اِن سے آگے ہے کچھ نظر میری

جو قدم ہے عدم کی راہ میں ہے
ختم شاید ہے رہگذر میری

دیکھ اے زندگی جھلکتی ہے
سرخیٔ شام میں سحر میری

اے کلیمؔ ابتدائے فطرت سے
مرکزِ حسن ہے نظر میری

ہر رنج کو سمو دے دُنیائے سرخوشی میں
ہوتا ہے دل شکستہ ناحق تُو زندگی میں

اِک مشغلہ سمجھ کر اک دل لگی سمجھ کر!
آیا ہوں سیر کرنے ہستی سے نیستی میں

ہر لحظہ اک سکوں تھا ہر لمحہ اک تسلّی
کیا آپ بولتے تھے دل کی شکستگی میں

گہرائیوں میں دل کی وُہ مسکرا رہے ہیں
یہ بات کب تھی پہلے میری ہنسی خوشی میں

کونین کیا بساطِ کونین کے سوا بھی
رقصاں ہر ایک شے ہے امواجِ زندگی میں

وُہ بھی ترا کرم تھا یہ بھی ترا کرم ہے
پھر بیخودی سے کیوں ہم لائے گئے خودی میں

سوز و گدازِ دل سے ہے نام زندگی کا
رکھا ہی کیا ہے ورنہ بے کیف زندگی میں

سچ ہے کلیمؔ کہنا سیماب[1] وارثیؒ کا
"کوسوں کا فاصلہ ہے عرفان و آگہی میں"

[1] سیماب اکبر آبادی

نہ جذبِ فطرت سے کام لیں گے نہ عقل کا کچھ کہا کریں گے
وہ جس روش پر ہمیں چلائیں اُسی روش پر چلا کریں گے

نہ اُن کے سینوں میں گرم دل ہے نہ اُنکی نبضوں میں کچھ حرارت
یہ خفتگانِ جہانِ فردا، پہنچ کے منزل پہ کیا کریں گے

یقینِ کامل ہو، عزمِ محکم، تو زندگی عینِ زندگی ہے
جہاں لگا دیں گے ایک ٹھوکر وہیں سے دریا بہا کریں گے

خوشی کی ہر موج سے نمایاں، ہزار جلوے نشاط آگیں
مگر یہ غم دوستئ دل کی خاطر خوشی کو بھی غم نما کریں گے

ہزار امیدوں کو لیکے آئے تھے اس جہانِ کرم نما میں
یہ کیا خبر تھی کہ زندگی کے چراغ جل کر بجھا کریں گے

بہت ہی نزدیک ہیں وہ دن بھی، تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیگا
خزاں کے جھونکے بہار بن کر چمن کی نشو و نما کریں گے

نہ جائزہ لے ہمارے دل کا، یہ قابلِ امتحاں نہیں ہے
کیا ہے کیا ابتدا میں ہم نے جو انتہا کا گلہ کریں گے

کلیمؔ احساسِ زندگی نے کیا ہے آوارہ زندگی کو
نہ صبح اپنی، نہ شام اپنی، یہ سوچتے ہیں کہ کیا کریں گے؟

دل مجھ سے دُور دُور ہے میں دل سے دُور دُور
کیا اَور ہو گا اب مری مشکل سے دُور دُور

رہتے ہیں اِس طرح وُہ مرے دل سے دُور دور
جیسے کہ چاندنی مہِ کامل سے دُور دور

اُمّید یہ نہ تھی نگہِ اِلتفات سے
وُہ مسکرائیں اور مرے دل سے دُور دُور

ہے زندگی مری کرم جاں گداز پر
آسانیاں رہیں مری مشکل سے دُور دور

نظارۂ جمال بھی ذوقِ وصال بھی!
کیا شئے ہے اپنی بارگہِ دل سے دُور دُور

یہ انتہائے غم کا تاثر تو دیکھئے
رہتا ہوں دل کے ساتھ مگر دل سے دُور دُور

ہر موج اپنی اپنی جگہ پر ہے کامیاب
ساحل کے قرب میں ہو کہ ساحل سے دُور دُور

اے عشق شکریہ ابھی اتنی تو ہے سکت
افتادگی کے ساتھ ہوں منزل سے دُور دُور

اُبھرے ہوئے کو ڈوبنا دشوار ہو گیا
موجیں سمٹ کے رہ گئیں ساحل سے دُور دُور

آوارگانِ عشق نہیں بے خبر کلیمؔ!
منزل کی جستجو میں ہیں منزل سے دُور دُور

○

کہاں سے لاکے، کہاں رکھ دیا زمانے کو
یہ آدمی کا تصرّف نہیں، تو پھر کیا ہے؟

ہر نفس اب مستقل ہے سوگوارِ زندگی
یعنی پروردہ خزاں کی ہے بہارِ زندگی

زندگی اب تو بنی جاتی ہے بارِ زندگی
آ کہ تیری ذات ہے پروردگارِ زندگی

صبح کے انداز کچھ ہیں، شام کے انداز کچھ
کیا تغیر خیز ہیں لیل و نہارِ زندگی

حسن کی کیفیتیں ہیں، عشق کا سوز و گداز
بس انہیں سے اوج پر ہے کاروبارِ زندگی

سوچتا ہوں آہ تو لب تک کوئی آتی نہیں
یک بیک پھر کیوں بھڑک اٹھے شرارِ زندگی

سیکڑوں راہیں نکلتی ہیں اسی اک راہ سے
سلسلہ در سلسلہ ہے رہگذارِ زندگی

میرا دامن آئینہ میر اگر یباں جامِ جم
اے جنوں اب کون ہے آئینہ دارِ زندگی

کہہ گئے آخر جہاں دیدہ دبی آواز میں
دُور ہے عقل و خرد سے کاروبارِ زندگی
اے کلیمؔ اُفتادگیِ عشق کا حاصل نہ پُوچھ
صاف ہے میرے لئے اب رہگذارِ زندگی

○

ساقی، ترا کرم ہے مگر اس کا علاج ؟
ٹھہرے نہ جام، جب کہ کفِ رعشہ دار میں

بڑا اعزاز ہے خلوت نشینِ حُسن ہونا بھی
عبادت ہے یہاں کا جاگنا بھی اور سونا بھی
جنُوں اک آخری منزل ہے مستانِ محبت کی
خُود اپنے آپ ہنسنا بھی خود اپنے آپ رونا بھی
یمِ ذخّار کی موجوں کو جو ساحل سمجھتا ہو
اُبھرنا بھی ہے اُس کو سہل اور خُود کو ڈبونا بھی
بُہت کچھ یاد آیا دشتِ غُربت میں کرم تیرا
یہ میرا سائباں بھی اور تکیہ بھی بچھونا بھی
بتا تُو ہی میں کیونکر سہل کر لوں اِس مصیبت کو
ترا نزدیک ہونا بھی ہے مشکل دُور ہونا بھی
میں انساں ہُوں مری فطرت کو آتا ہی بہر ساعت
طُلوعِ صبح ہونا بھی غروبِ شام ہونا بھی

کلیمؔ اِس جلوہ گاہِ ناز کی وُسعت کو کیا کہیے
تجلّیات سے خالی نہ پایا کوئی کونا بھی

جنوری ۲۰۰۵

نہ اپنا مدّعا سمجھے نہ اپنی آرزو سمجھے
شعورِ زندگی کو صرف تیری جستجو سمجھے

نمایاں کر دیا ہے اِن میں اُس نے خود کو پھر بھی ہم
بہاروں کو بہاریں رنگ و بُو کو رنگ و بُو سمجھے

شفق کی سرخیاں ہوں یا گلوں کی شعلہ کاری ہو
ترے دیوانے ان کو اپنے ہی دل کا لہو سمجھے

اِک ایسی بھی جھلک دیکھی ہے ہم نے مرغزاروں میں
جسے کیفِ بہارِ جلوۂ جام و سبو سمجھے

کلیمؔ اچھا ہُوا دل توڑ ڈالا نامرادی نے
مگر ہم دل کے ٹکڑوں کو بھی دل کی آرزو سمجھے

فروری ۵۵ء

شعورِ زندگی رکھنا خیالِ خیر و شر رکھنا
مگر ہر حال میں دل کی تگ و دو پر نظر رکھنا

یہی وہ زندگی ہے جس کو عینِ زندگی کہیے
جگر میں سوز رکھنا سوز میں برق و شرر رکھنا

محبت میں نہ منزل ہے، نہ جادہ ہے، نہ راہیں ہیں
جہاں رکھنا قدم پائے طلب کو توڑ کر رکھنا

بڑا مشکل ہے اس دنیا میں، جس میں دام پھیلے ہوں
نگاہ و دل کی آزادی کو اک انداز پر رکھنا

شناور جانتا ہے موج و دریا کی حقیقت کو
کہ دریا پر نہیں، دریا کی موجوں پر نظر رکھنا

کلیمؔ اہلِ نظر ہی جانتے ہیں کوئی کیا جانے
جہانِ خیر و شر کو ماورائے خیر و شر رکھنا

مارچ ۵۵ء

جو اپنا خونِ تمنّا اُچھال سکتا ہے
ہزار حسرتیں دل کی نکال سکتا ہے
وہی بناتا ہے اپنا جہانِ نَو اے دوست!
جو دل سے گردِ کدورت نکال سکتا ہے
ابھی تو سینۂ پُرسوز میں ہے سوز بہت
طرح طرح کے نظارے اُچھال سکتا ہے
ہزار سال کے بگڑے ہوئے زمانے کو
تو اپنے حُسن کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے

بُرے بھلے کی یہاں قید ہی نہیں ہے کلیمؔ
زمانہ جس کو اُچھالے اُچھال سکتا ہے

اپریل ۵۵ء

میں اپنی ہستی گمنام کو گمنام رکھتا ہوں
نہ اپنی صبح رکھتا ہوں نہ اپنی شام رکھتا ہوں

مری دنیا ہے درد و کرب و سوز و ساز کی دُنیا
زہے تقدیرِ غم میں اک دلِ ناکام رکھتا ہوں

میں اپنے جذبۂ پیہم کو اُبھرنے ہی نہیں دیتا
خیالاتِ پریشاں کو اسیرِ دام رکھتا ہوں

ترے رندانِ بے مقصد سے مجھ کو کیا غرض ساقی
کہ میں اک دل شکستہ ہوں شکستہ جام رکھتا ہوں

سُرورِ غم، نشاطِ محویت، سوز و گدازِ دل
یہ وہ کیفیتیں ہیں جن کو صبح و شام رکھتا ہوں

کلیمؔ اک دن وہ مل جائیں تو اتنا پوچھ لوں اُن سے
زمانے کیلئے میں بھی کوئی پیغام رکھتا ہوں

اپریل ۵۵ء

محبّت میں نہ جاں کو جاں نہ دل کو دل سمجھتے ہیں
اُسے آساں بناتے ہیں جسے مشکل سمجھتے ہیں

ہم اپنی زندگانی کی تغیّر خیز راہوں کو
کبھی جادہ سمجھتے ہیں کبھی منزل سمجھتے ہیں

ہمارا مقصدِ اوّل ہے جذبِ شوق و سرمستی
یہی وہ زندگی ہے جس کو ہم کامل سمجھتے ہیں

تُو اپنے دل کی کمزوری کو سمجھا ہے نہ سمجھے گا،
وہی مشکل میں ہیں مشکل کو جو مشکل نہ سمجھتے ہیں

کلیمؔ اہلِ تکلّم کی سبک باتوں سے کیوں اُلجھیں
ہم اپنی زندگی کو سہل یا مشکل سمجھتے ہیں

مئی ۱۹۵۵ء

یوں قطع کر رہا ہوں غربت میں اپنی راہیں
اُکھڑے ہوئے قدم ہیں بہکی ہوئی نگاہیں
گلشن کا پتّا پتّا بیدار ہو چکا ہے
یہ آپ بہتے چمن میں یا آپ کی نگاہیں
واقف نہیں وہ شاید خود اپنی زندگی سے
سائے میں زندگی کے لیتا ہے جو پناہیں

بے سُود سجدہ ریزی ہے یہ کلیمؔ تیری
معلوم ہیں جبیں کو خود اپنی سجدہ گاہیں

مئی ۵۵ء

مکاں سے لامکاں تک سلسلہ ہے جلوہ گاہوں کا
ہے یہ بھی معجزہ اہلِ محبّت کی نگاہوں کا

تصرّف ہے یہ شاید میرے دل کی شاہراہوں کا
مقامِ قرب سے آگے گذر جانا نگاہوں کا

میری راہوں میں دنیا ہے، نہ جنّت ہی نہ دوزخ ہے
الگ ہی راستہ ہے میرے دل کی شاہراہوں کا

ابھی سے گرم رَو کیوں ہو رہے ہیں آسماں والے
ابھی تو جائزہ لیتا ہوں خود اپنی نگاہوں کا

یہ دنیا ہے یہاں ہے، بے گناہی بھی گنہگاری
یہاں تو خوں بہانا بھی روا ہے بے گناہوں کا

کلیمؔ اہلِ محبّت اپنی دھن میں مست و بیخود ہیں
اِنہیں کچھ اپنی منزل کا پتہ ہے اور نہ راہوں کا

دسمبر ۵۵ء

"متاعِ کلیمؔ"

گردشوں میں رہتے ہیں آفت کے مارے روز و شب
دیکھتے ہیں آسماں کے چاند تارے روز و شب

وُہ بھی اک دن آئیگا جس کا تمہیں ہے انتظار
ہوتے رہتے ہیں اشاروں پر اشارے روز و شب

دن کی جلوہ ریزیاں، اور رات کی تاریکیاں
کرتے ہیں پیدا مرے دل کے شرارے روز و شب

کور ذوقی کا بُرا ہو، ورنہ اک اک گام پر
تیری فطرت خود بناتی ہے نظارے روز و شب

یا کسی کی جستجو ہے یا کسی کا انتظار
گھومتے رہتے ہیں دُنیا کے کنارے روز و شب

کچھ نہیں، پھر بھی ہے کچھ اس پردۂ زنگار میں
ورنہ گردش میں ہیں کیوں یہ چاند تارے روز و شب

آسماں والے مجھے پہچانتے ہیں اے کلیمؔ!
میرے سوزِ عشق سے بنتے ہیں تارے روز و شب

دسمبر ۵۵ء

لُطف و کرم سے آپ کے اُکتا گیا ہوں میں
وہ زندگی عطا ہو جیسے چاہتا ہوں میں

کتنا عجیب ہے یہ مرا ذوقِ آگہی
جو جانتا ہوں وہ بھی نہیں جانتا ہوں میں

جادہ سے کچھ غرض ہے نہ منزل سے واسطہ
جب دوڑتا ہوں تیری طرف دوڑتا ہوں میں

مرنا بھی اک فریب ہے جینا بھی اک فریب
ہستی کے ہر فریب کو پہچانتا ہوں میں

یہ رُوحِ زندگی کے تصرّف میں اے کلیمؔ
جو شئے نہاں ہے اسکو عیاں دیکھتا ہوں میں

دسمبر ۵۵ء

دل کی حالت پر اگر تو خندہ لب ہو جائے گا
رنج بھی تیرے لئے موجِ طرب ہو جائے گا

ہنستے ہنستے راہ و منزل سے گذر جائینگے ہم
رنج سہتے سہتے جب دِل غم طلب ہو جائے گا

کچھ نہ کچھ ہو جائے گا دل سوز و سازِ عشق سے
خاک ہو جائے گا یا برقِ غضب ہو جائیگا

ہوش گم ہو جائیں گے بڑھ جائیگا ذوقِ طلب
عشق اپنے حال پر جب خندہ لب ہو جائیگا

پھر یہ تیری زندگی ہو گی حقیقی زندگی
جب کہ تو اپنی طلب سے بے طلب ہو جائیگا

آپ اگر دیکھیں نگاہِ گرم سے میری طرف
میرا مر جانا بھی جینے کا سبب ہو جائے گا

کار آمد ہوں نہ ہوں سجدے، غم اس کا کیا کلیمؔ
بیش و کم سر کا جھکانا ہی ادب ہو جائیگا

دسمبر ۵۵ء

وُہ دل کہ جس کو ہوش نہیں اپنے حال کا
اندازہ کیا لگائیں ہم اُس کے مآل کا

اب تذکرہ نہ چھیڑ زمانے کے حال کا
اک آئینہ ہے یہ بھی عروج و زوال کا

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں تری بزمِ ناز میں
فردا کی فکر جن کو، نہ اندیشہ حال کا

آگے بڑھیں تو کیسے بڑھیں تیری راہ میں
پائے طلب میں خار ہے امرِ محال کا

سب اپنے اپنے حال میں سرمست ہیں کلیمؔ
پُرساں ہوا ہے کون یہاں کس کے حال کا

دسمبر ۵۵ء

دل کہ اپنے حال سے بیگانہ جب ہو جائیگا
ایک تازہ زندگانی کا سبب ہو جائیگا
خاک ہو جائے اگر تُو اپنے سوزِ عشق سے
زندہ دل زندہ نفس تیرا لقب ہو جائیگا
صبر و استقلال سے اس زندگی میں کام لے
جو بھی ہونا ہے ترے حق میں وہ سب ہو جائیگا

چھیڑنا اچھا نہیں آفت کے ماروں کو کلیم
ورنہ اِن کا آہ کرنا بھی غضب ہو جائیگا

دسمبر ۵۵ء

محبّت ہے تو تم بھی ہو محبّت ہے تو میں بھی ہوں
محبّت ہے تو عقبیٰ ہے محبّت ہے تو دنیا ہے

جہانِ رنگ و بو میں زندگی گذری مگر اب تک
نہ یہ معلوم میں کیا ہوں نہ یہ معلوم وہ کیا ہے

یہاں تو اک تبسّم بھی گراں ہے شور و شر کیسا؟
الٰہی کیا یہی سوز و گدازِ دل کی دنیا ہے

ابھی سمجھا نہیں مردِ حق آگہ کی سیاست تو
جہاں شبنم ہے شبنم ہے جہاں شعلہ ہی شعلہ ہے

کلیمؔ اللہ والوں سے کوئی پوچھے تو یہ پوچھے
کہ آدابِ محبّت کیا ہے تسلیم و رضا کیا ہے

اپریل ۵۴ء

جذباتِ شوق ایک ہی منزل پہ آ گئے
لب اُن کے ہائے کیسا فسانہ سُنا گئے
کچھ اس طرح وہ گوشۂ دل میں سما گئے
جیسے ہم اپنی زیست کے حاصل کو پا گئے
ٹوٹا نہ کاروانِ محبت کا سلسلہ
ہارے تھکے سب ایک ہی منزل پہ آ گئے
سُن سُن کے کانپ اُٹھتے تھے جن سے سلف لوگ
وہ حادثے بھی آ گئے وہ دن بھی آ گئے
ہم بھی وہی ہیں شام وہی ہے سحر وہی
لاکھ انقلاب دہر میں آنے کو آ گئے

اچھا ہوا کہ معرکۂ عشق میں کلیمؔ
ہر مدعی کے سامنے ہم مات کھا گئے

مایوس نہیں حادثۂ بے اثری سے
زندہ ہے ابھی روح دعائے سحری سے

دل میں مگر احساس کا جذبہ نہیں رکھتے
مانوس تو ہیں لوگ تری جلوہ گری سے

اب آپ ہی کہیئے کہ وہ کیوں ہوش میں آئے
ملتی ہو جسے اپنی خبر بیخبری سے

اب وہ بھی ہوا صرف نظارونکی ہوس میں
آنکھونمیں جو کچھ نور تھا اشکونکی تری سے

دُنیائے محبت ہی یہ دُنیائے محبت
جیتی ہیں یہاں لوگ بڑی بے جگری سے

کھوئی ہوئی ہر چیز کا کھوئے ہوئے دل کا
ملتا ہے پتہ جادۂ آشفتہ سری سے

دنیا تو کرشمہ ہے کلیم ان کی نظر کا
شائستہ ہیں جو لوگ صفاتِ بشری سے

کیا خُوب دردِ عشق کی تقسیم کی گئی
مانگا تھا جس نے سوز اُسے آگ دی گئی

مطلب یہ تھا کہ اور کسی کو خبر نہ ہو
دل کی پکار دل کی زباں سے سُنی گئی

تکمیلِ حُسنِ پیکرِ خاکی کے واسطے
ہر چیز کائناتِ محبت سے لی گئی

اُس وقت بھی ہمیں تھے ترا مطمحِ نظر
جب کاروبارِ عشق کی تکمیل کی گئی

سوئی ہوئی حیات جگائی تو اس طرح
پُر سوز ایک لے مرے نغموں کو دی گئی

آدابِ بزمِ ناز کی مجبوریاں نہ پُوچھ
کہنے کی بات بھی نہ زباں سے کہی گئی

جب تک تھے اہلِ ہوش خودی بھی تھی اے کلیمؔ
جب ہوش گم ہوئے تو خودی بھی چلی گئی

اب اس منزل پہ آ پہونچی ہے میرے دل کی بیداری
گراں باری میں بھی محسوس کرتا ہوں سُبکساری
خداوندا مرے پائے طلب کو استقامت دے
زمانہ سازِ دُنیا میں کہاں ذوقِ وفاداری
بشر کی قوّتِ پرواز اہلِ عرش کیا جانیں
نہ اُن کے پاس ہمت ہے، نہ جُرأت ہے، نہ غمخواری
تمہیں ہشیار رہنا چاہیئے اے آسماں والو!
کہ میرے شعلۂ دل سے اُٹھی ہے ایک چنگاری

کلیمؔ اِس دَورِ آخر کے امیرِ کارواں، توبہ!
نہ دل میں دردِ منزل ہے، نہ ہے عرفانِ دشواری

جھگڑا نہیں رہا کوئی نابود و بود کا
نقشہ مری نظر میں ہے غیب و شہود کا

آیا کبھی نہ میری جبینِ نیاز کو
آداب کا طریقہ، سلیقہ سجود کا

بس اِس قدر ہے عمرِ دو روزہ کی کیفیت
اِک روز بست کا ہی تو اِک دن کشود کا

کیا زندگی ہے جس کی حیات و ممات میں
کھٹکا لگا ہوا ہے زیاں اور سود کا

جُھک جانے کی ادا بھی اُسے یاد ہے کلیمؔ
اُونچا اگرچہ سر ہے سپہرِ کبود کا

نغمہ پیرا کون ہے جذباتِ سوز و ساز میں
کس نے بھر دیں اپنی آوازیں مری آواز میں
مرنے والے جی اُٹھے ہیں رہ گذارِ ناز میں
زندگی اب کیا رہا ہے زندگی کے راز میں
عجز کی منزل جُدا ہے کبر کی منزل جُدا
یہ بھی اپنے ناز میں ہے وُہ بھی اپنے ناز میں
تُجھ سے ہے ہر چیز اور ہر چیز سے تُو ماورا
راز تُو کونین کا، کونین تیرے راز میں
ساتھ ہی دُنیا کے تُجھ کو بھی بدلنا چاہیئے
دیکھ ہر ساعت بدلتی ہیں صدائیں ساز میں
مُلک اُن کا ہے قلم اُن کا ہے تلوار اُنکی ہے
شعر کہنا جانتے ہیں جو زبانِ راز میں
وائے قسمت لیچلا ہے ہم صفیروں کو مرے
چند دانوں کا تصوّر، دامِ حرص و آز میں
شور و غوغا ہو کہ پچھلی رات کے نغمے کلیمؔ
دلکشی پاتا ہوں ہوں اکثر دُور کی آواز میں

کون منّت کشِ اربابِ خرد ہوا ے دوست
کام چل جاتے ہیں دنیا میں قرینے کے بغیر
زندگی موت کی ہم شکل ہوئی جاتی ہے
اب تو جینا ہی پڑے گا ہمیں جینے کے بغیر
ڈوبتا بھی ہوں اُبھرتا بھی ہوں موجوں کی طرح
مجھ کو منزل پہ پہنچنا ہے سفینے کے بغیر
جس میں کونین کی ہر چیز سما جاتی ہو
وسعتیں ایسی کہاں ہیں مرے سینے کے بغیر

کس قدر درد بھرا مصرعِ فانیؔ[1] ہے کلیمؔ
"ہم کو مرنا بھی میسّر نہیں جینے کے بغیر"

[1] فانی بدایونی

سوزشِ ذوقِ التفات کہاں؟
بجھ گیا دل، تو پھر حیات کہاں؟

مسکرانا بھی بارِ خاطر ہے
زندگی موت ہے حیات کہاں؟

خود ہی ذاکر ہے اور خود مذکور
ذات ہی ذات ہے صفات کہاں؟

ہر نفس معجزہ ہے فطرت کا
ہر نفس میں مگر وہ بات کہاں؟

مرگ بھی اِک فریب جینا بھی!
مجھ کو لائی مری حیات کہاں؟

ہو تو سکتا ہے ہر دعا میں اثر!
لیکن اے دل وہ پچھلی رات کہاں؟

ذرّہ ذرّہ ہے تیز خاروں سے
دشتِ غربت میں التفات کہاں؟

مِٹ چکا دل کا سوز و ساز کلیمؔ
اب وہ زندہ تخیّلات کہاں؟

ان بجلیوں کی زد میں اک لطفِ زندگی ہے
جلنے کو جل چکا ہے سو بار آشیانہ

آسانیوں کی صورت ہر شے میں دیکھتا ہوں
کیوں ہو گیا ہے مشکل میرے لئے زمانہ

پہچاننے لگا ہوں میں زندگی کی راہیں
احساں ہے یہ بھی تیرا اے گردشِ زمانہ

سوزِ درونِ دل سے اُڑنے لگے شرارے
یعنی کہ ہر نفس ہے تاروں کا شامیانہ

خود اپنی زندگی سے لیتا ہوں درسِ فطرت
میری سرشت میں ہے ہر رنگ کا فسانہ

گرمِ سخن رہے ہیں برسوں کلیمؔ سے ہم
رکھتا ہے اپنے دل میں اِک سوزِ جاودانہ

صد شکر کہ پُرزے پُرزے یہ دامان و گریباں ہو تو گیا
اِس وحشتِ دل کے ہاتھوں کچھ تسکین کا ساماں ہو تو گیا
اب اِس سے بڑھ کر کیا ہو گا کچھ اَور خزاں کے آنے سے
برسوں کا پھلا پھولا گلشن اک آن میں ویراں ہو تو گیا
اے جذبِ محبّت اب تیرے احساس کی قدر و قیمت کیا؟
وُہ دیکھ سرشکِ غم ڈھل کر مژگاں پہ نمایاں ہو تو گیا
وہ شور نہیں، آواز نہیں، وہ وحشت کے انداز نہیں
دیوانہ ترا رفتہ رفتہ مانوسِ زنداں ہو تو گیا!

آنے کو بہاریں آتی تھیں، لیکن ہم رنگِ خزاں ہو کر!
اک دَور ترا بھی گلشن میں اے گردشِ دَوراں ہو تو گیا

یہ فریب ہیں خرد کے کہ تضادِ کفر و دیں ہے
ہے جہاں گماں، گماں ہی، ہے جہاں یقیں، یقیں ہے

وہ جہانِ خیر و شر کے خم و پیچ سے ہے واقف
جو دماغ تیز تر ہے، جو نگاہ دور بیں ہے

مری وحشتوں نے مجھ کو وہ مقام بھی دکھائے
جہاں خیر ہے نہ شر ہے جہاں کفر ہے نہ دیں ہے

تری بے نیازیوں سے یہ سمجھ لیا ہے میں نے
مری زندگی بھی آخر مری زندگی نہیں ہے

ترے فرش پر ہوں خاکی ترے عرش پہ ہوں نوری
مرے ابتدا کہیں ہے، مری انتہا کہیں ہے

کہوں کیا کلیمؔ تجھ سے کہ وہ حادثاتِ پیہم
یوں گذر گئے کہ جیسے مجھے کچھ خبر نہیں ہے

دل شیشہ بھی ہے پتھّر بھی، احساس سے لیکن دور نہیں
اِک ٹھیس سے چکنا چور بھی ہی اک ٹھیس سے چکنا چور نہیں
اِن راز و نیاز کی باتوں میں اِک رنج بھی ہی اک راحت بھی
میں کہتا ہوں دل حاضر ہی، وہ کہتے ہیں منظور نہیں
کیوں بھٹکے سیدھی راہوں سے کیوں ترکِ ظلم و جور کرے
وہ رہبر کا دستور نہیں، یہ رہزن کا دستور نہیں

تو راہِ محبت میں اے دل عجلت سے کوئی کام نہ لے
یہ عشق ہے اس میں ہر انساں مجبور بھی ہی مجبور نہیں

دل ہے کہیں خیال کہیں ہے نظر کہیں
دیوانہ اپنے حال سے ہے بے خبر کہیں

آوارگانِ عشق کی منزل نہ پوچھئے
ہر لحظہ اِن کی شام کہیں ہے سحر کہیں

پوشیدہ ہے اسی میں مری بندگی کا راز
دیکھ، اے جنونِ شوق جھکا دوں نہ سر کہیں

دل مرکزِ جمال ہے ہم مرکزِ صفات
دل کی نظر کہیں ہے ہماری نظر کہیں

رُوئے جمالِ یار ہو، یا برقِ حُسنِ طُور
یہ اشتیاقِ دید کہ ٹھہرے نظر کہیں

انفاس لاکھ سردِ ہوا دیں مگر کلیمؔ!
بجھتی ہے جل کے آتشِ سوزِ جگر کہیں؟

اُس کو ملتا ہے لقب عشق میں فرزانے کا
بےخودی میں بھی جسے ہوش ہو بیگانے کا

آج کعبہ کیطرف رُخ ہے صنم خانے کا
ہو نہ ہو یہ ہے یہ تصرّف ترے دیوانے کا

آ بھی جا لے کے گلستاں میں بہاریں اپنی
آج ہر پھُول کو ہے شوق نکھر جانے کا

کس کشاکش کی یہ دنیا ہے الٰہی توبہ!
لطف جینے ہی کا اِس میں ہے نہ مر جانے کا

عشق تمہید مرے سوز و گدازِ دل کی
حُسن اک شعلہ مرے دل کی نہاں خانے کا

ہے کہیں موجِ تبسّم تو کہیں موجِ بہار
ایک قطرہ مرے چھلکے ہُوئے پیمانے کا

آپ ہی آپ نظر آئے سرِ طُور کلیم
ذکر چھیڑا جو کہیں طُور کے افسانے کا

کون لے گیا دل سے سوز و سازِ رعنائی
صبح سے جھلکتی ہے آج شامِ تنہائی

دہر کی فضاؤں میں کون رقص کرتا ہے
کون کر رہا ہے یوں، آپ اپنی رُسوائی

ایک اِک نفس میں تھا کیف و وجد کا عالم
دل، کہ بھول بیٹھا اب ذوقِ نغمہ پیرائی

دار و گیرِ دُنیا کو اے کلیمؔ کیا کہیئے!
یعنی کہ اِس زمانے میں خامشی ہے گویائی

لہو کا قطرہ قطرہ تیرا لاحاصل نہ بن جائے
وہاں تک کوششیں لازم ہیں جب تک دل اثر بن جائے

جہاں موجوں کے نغمے ہوں جہاں شورش ہو طوفاں کی
وہ منظر کیوں نگاہِ دل کا مستقبل نہ بن جائے

نگاہیں بجلیوں کی ہیں مری خاکسترِ دل پر
کہ یہ تو وہ نگاہِ ناز کے قابل نہ بن جائے

مری پروازِ فطرت پر ستارے کیوں لرزتے ہیں
انہیں ڈر ہے کہ یہ ذرّہ مہِ کامل نہ بن جائے

کلیمؔ اس دور میں جلوے ہی جلوے ہیں نگاہوں میں
کہو وہ کون سا دل ہے جو طورِ دل نہ بن جائے

سکوں کی منزل پہ گامزن ہوں، خموشیاں میری خوابگاہیں
نفس کی موجیں بھی تھم گئی ہیں، نہ لب پہ نالے نہ دل میں آہیں
اس آب و آتش کی دوستی کو بتائیے کس طرح نباہیں
جو آپ چاہیں وہ میں نہ چاہوں، جو میں نہ چاہوں وہ آپ چاہیں
یہ فرق کچھ فرق تو نہیں ہے، اگر ہے کچھ فرق تو بس اتنا
تمہارے دامن کے پھول شعلے، ہمارے دامن کے پھول آہیں

تمہاری جلوہ فریبیوں کو حیاتِ نو جو سمجھ رہے ہیں
انہیں کا دل ہے، انہیں کی منزل، انہیں کا جادہ، انہیں کی راہیں

کام یہ شانِ کرم نے کیا غفّاری کا
بھر دیا خون رگ و پے میں خطا کاری کا

یُوں کہیں ہوش میں آتے ہیں ترے دیوانے
ہو لبِ حُسن پہ نغمہ کوئی بیداری کا

یہ تو اِک نام ہے ہم برق جسے کہتے ہیں
آتشِ عشق کی اڑتی ہوئی چنگاری کا

اِن دو لفظوں کی ذرا شرح تو کر اے ناصح!
تجھے عصیاں کا مجھے خوف ریا کاری کا

دو قدم اور بھی اے جذبۂ دشوار طلب
سلسلہ ختم ہُوا جاتا ہے دشواری کا

بےخودی بھی ہے عجب چیز محبّت میں کلیم
خواب میں لطف اٹھاتے رہے بیداری کا

جانے کیا دیکھا تصوّر میں کہ حیراں ہو گئیں
میری آنکھیں یادگارِ بزمِ امکاں ہو گئیں

دیدنی تھیں کیا مرے جوشِ جنوں کی وحشتیں
رفتہ رفتہ جو نمائش گاہِ زنداں ہو گئیں

کچھ وفورِ جوششِ گریہ پہ ہی نہیں ہے منحصر
اپنی حد سے جو بڑھیں موجیں وہ طوفاں ہو گئیں

آپ آئے تھے چمن میں یا کہ آئی تھی بہار
بجلیاں کیوں خندہ ہائے گُل پہ رقصاں ہو گئیں

کچھ خبر ہے آپ کے جلوؤں کی شعلہ باریاں
پیکرِ خاکی کی فطرت سے نمایاں ہو گئیں

رسم و راہِ عشق کی مجبوریاں بھی اے کلیمؔ!
یوں ہوئیں مانوس جیسے دین و ایماں ہو گئیں

جنوری ۵۲ء

سمجھنا ہے اگر کچھ اپنے دل کی بیقراری کو
تو بیہوشی کی دنیا میں سمو دی ہوشیاری کو

چمن زاروں پہ اک کیفِ مسرّت ہو گیا طاری
شگوفے پھوٹ نکلے دیکھ کر بادِ بہاری کو

بظاہر پستیوں میں ہوں بہ باطن عرشِ اعلیٰ پر
کہاں پہنچا دیا ہے تو نے میر خاکساری کو

مکان و لامکاں کی سیر کر لیتا ہوں ہر ساعت
بہت کچھ دخل ہے روحانیت میں بیقراری کو

شگفتہ دل کی کیفیّت کو جب سمجھا تو یہ سمجھا
بہت نزدیک لایا ہوں چمن کی شعلہ کاری کو

کلیمؔ انسانیت کا راز خود انساں سمجھتا ہے
کسی نوری کو یہ دولت ملی ہے اور نہ ناری کو

فروری ۶۰۵۲

گُل کے فسردہ ہونے کو غنچۂ نورس کیا جانے
اور اگر جانے بھی تو ہنس ہنس کر کِھلنا کیا جانے

جذبِ دل کی موجوں سے کھیل رہا ہوں اے ساقی
میرے دل کی موجوں کو موجِ صہبا کیا جانے

جوشِ جُنوں کی وحشت کو ٹوٹے دل کے ذرّوں کو
کیا گردِ صحرا پہنچے، کیا گردِ صحرا جانے

دل کی شکستہ حالت پر وہ خوش ہیں یا میں خوش ہوں
اس دُنیا کی کیفیّت بندۂ دُنیا کیا جانے

دل کی نظر سر گشتہ کلیمؔ جانے کہاں تک پہنچی ہے
دیکھ رہا ہوں میں جو کچھ اس کو دُنیا کیا جانے

جنوری ۱۹۵۱ء

پرسشِ غم نے چھیڑ کر صبر و قرار کھو دیا
دل تھا، نہ ضبط کر سکا، اشک بھر آئے رَو دیا
ذوقِ طلب میں بارہا عرش بھی فرشِ پا رہا
تُو نے عروج اِس قدر میرے خیال کو دیا
فقر ہی فقر کے سوا بندہ کے پاس کچھ نہیں
اِس کا حساب تو سمجھ بندے کو تُو نے کیا دیا

چشمکِ برقِ طُور سے اتنا ہوا کہ اے کلیمؔ
بحرِ تجلّیات میں لا کے مجھے ڈبو دیا

فروری ۱۹۵۱ء

آپ کی محبّت میں اور ہم نے کیا جانا
ہجر کا مزا چکھا، درد کا مزا جانا
موجۂ تلاطم کا عشق میں سہارا کیا
خود ہی ڈوب کر ہم نے ساحلِ فنا جانا
منظرِ حقیقت کی دلکشی معاذ اللہ
نور بن کے آنکھوں میں یک بیک سما جانا
بار ہا محبت میں مر کے زندگی پائی
پھر بھی اس محبّت کا کچھ نہ مدعا جانا

یہ بھی اے کلیمؔ آخر عقل کی تھی کوتاہی
یعنی ابتدا تھی وہ جس کو انتہا جانا

مارچ ۱۹۵۱ء

گہر میرا دل ہے صدف میرا سینہ
کہ میں ہوں تری معرفت کا خزینہ
نظر آئیں گی سرخیاں میرے خوں کی
جو تم چیر دیکھو بہاروں کا سینہ
بہار آئی اور موج در موج آئی
اڑا لے گئی میرے دل کا سفینہ
یہ تسکینِ دل بھی یہ تسکینِ جاں بھی
ہواؤں میں ہوتا ہے گل کا پسینہ

وہی زندہ دل ہیں کلیم اس جہاں میں
محبّت سے معمور رہے جن کا سینہ

مارچ ۱۹۵۱ء

رنج نے بخشا سکوں تڑپایا راحت نے مجھے
کیا نرالی زندگی دیدی محبت نے مجھے

ہے اُسی کی کارفرمائی حیات اندر حیات
دیدیا تھا اک شررِ سوزِ محبت نے مجھے

رازِ ہستی کون سمجھاتا، مگر سمجھا دیا
صرف اک ٹوٹے ہوئے دل کی حقیقت نے مجھے

میرے دل کو بخش دی سارے زمانے کی خلش
جانے کیا سمجھا ہے منشائے محبت نے مجھے

میرے رُوح و دل میں اک ہیجان برپا کردیا
کس محبت سے پکارا آدمیت نے مجھے

مصلحت آمیز ہوتی ہے زمانے کی رَوِش!
کیا ہوا جو دے دیا دھوکا محبت نے مجھے

دوست دشمن کی نظر پہچان لیتا ہوں کلیمؔ
اِس قدر ادراک تو بخشا ہے فطرت نے مجھے

جُون ۱۹۵۰ء

ملے گی صفحۂ ہستی پہ اکثر داستاں میری
کہیں ذوقِ بیاں میرا کہیں طرزِ فغاں میری

خبر بھی ہے تمہیں اے ساکنانِ آسماں میری
محبّت بنتی جاتی ہے حیاتِ جاوداں میری

نہیں محدود اے ذوقِ جنوں سرگرمیاں میری
پرِ جبریلؑ سے آگے ہے رُوحِ پرفشاں میری

لگائے کون اندازہ مرے ضبط و تحمّل کا!
حدِ آداب سے جاتی نہیں باہر فغاں میری

ہو موجوں کی بلاخیزی کہ طوفانوں کی یورش ہو
بڑھے جاتی ہے پھر بھی کشتیِ عمرِ رواں میری

کتابِ دہر میں اکثر یہی دو باب ملتے ہیں
کہیں ہے تذکرہ اُن کا کہیں ہے داستاں میری

کلیمؔ آوارگیِ عشق کچھ کچھ رنگ لائی ہے
چمن ہے داغِ دل میرا بہاریں ہیں خزاں میری

۱۸ / اپریل ۵۰ء

کہیے تو کیا کہیے بزمِ امکاں کو
اک حیرت میں ڈال دیا ہی انساں کو

تاروں کا اک مینھہ برسا ہے عالم پر
یوں کس نے جھٹکا ہے اپنے داماں کو

ہم نے تو احسان کو احساں سمجھا ہے
بھولنے والے بھول گئے ہیں احساں کو

اس کو جانو پہلے جس نے دنیا میں
فطرت کے آداب سکھائے انساں کو

خاموشی کو جو دیتا ہے گویائی
جاں بخشی ہے اُس نے حرفِ بیجاں کو

پروانے کی فطرت سے لے درس کلیمؔ
پھونک دے تو بھی دل کے ساز و ساماں کو

اگست ۵۰ء

عشق آوارہ کسی راہگذر سے گذرے
حُسن کیوں ہر کس و ناکس کی نظر سے گذرے

وُہ مقامات تری شام و سحر میں بھی نہیں
جو مقامات مری فکر و نظر سے گذرے

اک قدم راہ میں تھا ایک قدم منزل پر
ایسے کچھ لوگ بھی اس راہ گذر سے گذرے

مرہم زخمِ جگر بھی ہے، نشاطِ دل بھی
وُہ محبّت جو محبّت کی نظر سے گذرے

اپنی ہستی سے وُہ کچھ دُور نظر آتے ہیں
جو کبھی نفع سے گذرے نہ ضرر سے گذرے

جذبِ دل وُہ ہے جو دل توڑ کے نکلے باہر
ہے دُعا وُہ، جو دُعا بابِ اثر سے گذرے

سیکڑوں بار ملی رُوح کو اک تازہ حیات
سیکڑوں بار محبّت کی نظر سے گذرے

"متاعِ کلیم"

جس جگہ بیٹھے تھے، بیٹھے رہے دیوانے ترے
آندھیاں آئیں، بگولے کئی سر سے گذرے

جنھیں بیکار سمجھتے تھے، وہ دل کے ٹکڑے
للّٰلہ الحمد کہ آج اُن کی نظر سے گذرے

سادہ دل کی روشِ سادہ کو معلوم نہیں
خیر کی راہ گذرنا ہو تو شر سے گذرے

دل تو بیگانہ نہ تھا ہوش کی منزل سے کلیمؔ
پھر یہ خطرات جو دل میں ہیں کدھر سے گذرے

۲۲ ستمبر ۶۰ء

اپنی ہستی کی حقیقت سے خفا ہو جانا
ایسا ہے جیسے خود اپنا ہی خدا ہو جانا

اے جنوں شیوۂ آدابِ محبّت کیا ہے
خود بخود تابعِ تسلیم و رضا ہو جانا

کفر ہے مذہبِ اربابِ وفا میں یہ دوست
دل سے احساسِ محبّت کا فنا ہو جانا

دلِ ناداں کو یہ انداز سکھائے کس نے
کہ مجسّمِ طلبِ راہِ وفا ہو جانا

زندگی نام اسی کا ہے محبّت میں کلیمؔ
ہو کے آزاد گرفتارِ بلا ہو جانا

نومبر ۵۰ء

ایک دل آسودۂ فطرت کہاں سے لاسکے
خود بھی تڑپے اور دُنیا کو بھی جو تڑپا سکے

خود سمجھنا ہے ہمیں تو اپنی ہستی کا پیام
غیر کیا سمجھے کسی کی بات کیا سمجھا سکے

سوزِ دل کے ہر شرر سے پوچھتا رہتا ہوں میں
ہے کوئی جو شعلۂ بے باک سے ٹکرا سکے؟

کس قدر آزاد ہے اہلِ جنوں کی زندگی
جو نہ دھوکا دے کسی کو جو نہ دھوکا کھا سکے

اب دلِ پُرخوں میں ایسا جوشِ رندانہ کہاں
اک نظر میں جو زمانے کی روش پلٹا سکے

نومبر ۶۰ء

اگر ہم عشق کی برباد راہوں پر چلا کرتے
تو ہر اُفتاد سے اک زندگی پیدا کیا کرتے

مرے جذباتِ دل برباد ہو کر اور کیا کرتے
بلندی سے جو گر جاتے تو پستی سی اٹھا کرتے

تقاضا تو یہی ہے کارفرمایانِ فطرت کا
جہاں سے ابتدا کی ہو وہیں سی انتہا کرتے

گذرنا تھی جو میرے حال پر اک دن گذر جاتی
نہ کچھ اہلِ کرم کرتے نہ کچھ اہلِ وفا کرتے

سہارا گر نہ ملتا زندگی کو موجِ طوفاں کا
تو ہم اس زندگی سی کھیل جاتے اور کیا کرتے

کلیمؔ اپنے دلِ درد آشنا سے خوش تو ہیں لیکن
مزا جب تھا کہ ہر شے کو دلِ درد آشنا کرتے

جنوری ۹۴۹ء

"متاعِ کلیم"

جب انساں شورشِ بزمِ جہاں سے دُور ہوتا ہے
تو اس کا ہر نفس ہمدوشِ برقِ طُور ہوتا ہے
اُسی کے واسطے سب کچھ ہے دُنیائے محبّت میں
متاعِ زندگی کو کھو کے جو مسرور ہوتا ہے
یہی کیفیتیں ہوتی ہیں اکثر جذب و مستی میں،
کبھی دل عرش ہوتا ہے کبھی دل طُور ہوتا ہے
ہمیشہ کھیلتا رہتا ہے جو طوفاں کی موجوں سے
سہارا اُس کو تنکے کا بھی نامنظور ہوتا ہے
اگر نزدیک سے ہو تو دل کشی باقی نہیں رہتی
وہی منظر ہے دلکش جو نظر سے دُور ہوتا ہے
یہ حالت بھی تعجّب خیز حالت ہے مرے دل کی
جہاں مختار ہوتا ہے وہیں مجبُور ہوتا ہے
کلیم اہلِ بصیرت دیکھتے ہیں کہہ نہیں سکتے
کہ ہر دار و رسن کے ساتھ اِک منصُور ہوتا ہے

فروری ۱۹۴۹ء

دیکھے نہیں کیا تُو نے جوہر اپنے دل کی ہستی کے
پھول ہیں کچھ دامن میں اسکے جذب و کیف و مستی کے

رنج و غم و آلام و حرماں اور کہاں اب جائیں گے
رہنے والے ہیں یہ تیرے دل کی اُجڑی بستی کے

کِس نے جانا کِس نے سمجھا آب و گِل کی ہستی کو
راز بہت پیچیدہ نکلے آب و گِل کی ہستی کے

جِس قیمت پر بھی مل جائے جنسِ وفا لے ہمدم
عِشق میں سب بیکار ہیں جھگڑے مہنگی کے اور سستی کے

وہ روحانی کیفیّت ہے دل کے ان نغموں میں نہاں
ہوش بجا رہتے ہی نہیں ہیں سُن کر بزمِ ہستی کے

اَوجِ ثریّا پر ہے میرے اشکِ غم کی تابانی
دیکھ کلیمؔ! کہاں پہونچے ہیں چاند ستارے ہستی کے

مارچ ۹۴ء

سوچ رہا ہوں پھول اُلجھتے رہتے ہیں کیوں خاروں سے
خاروں کو نسبت ہی بھلا کیا ہے اِن لالہ زاروں سے

رُک کے سے رُکتے ہی نہیں جو اُن کی فطرت دیکھ
اے رہرو کچھ درس لیا کر تو اِن بہتے دھاروں سے

ترکِ دُنیا کرنیوالوں کو شاید معلوم نہیں!
پھونکی جاتی ہے یہ دولت دل کے چند شراروں سے

منزل منزل جادہ جادہ رہتے ہیں بے نام و نشاں
سیکھی ہے آوارہ گردی ہم نے یہ سیاروں سے

باکاروں پر جب چھا جائیں غفلت کے کالے بادل
فطرت اپنا کام نہ لے کیوں آخر پھر بیکاروں سے

پھولوں کا کیا ذکر یہاں تو خار بھی ہیں بے سوز کلیم
بہلے تو دل کیوں کر بہلے اِن سُونے نظّاروں سے

جولائی ۴۹ء ۶

شکستہ دل کی حقیقتوں پر لگائے جاتے ہیں تازیانے
خزاں سے اُجڑے ہوئے چمن میں بہار آئی ہے مسکرانے

وہی ہو تم بھی، وہی ہوں میں بھی، وہی ہے دنیا وہی فسانے
یہ ایک پردہ تھا جس کی خاطر ہزار بدلے گئے زمانے

کوئی کہاں تک فریب کھائے کہاں کہاں سر جھکائے اپنا
تمہاری جلوہ طرازیوں کے قدم قدم پر ہیں آستانے

یہ نغمہ سوزی یہ کیف و مستی، تڑپ اُٹھے کیوں نہ بزمِ ہستی
جو لحن داؤد میں نہاں تھے وہی ملے ہیں مجھے ترانے

روش بدل دے گا زندگی کی طلسمِ ہستی کا ٹوٹ جانا
وہیں ابھی تک نظر ہے میری گزر چکے ہیں جہاں زمانے

فقیر کو ہر جگہ ہے راحت اگر ہے صبر و رضا کا مالک
تنے ہوئے ہیں نظر میں اُس کی سکون و تسکین کے شامیانے

ہزاروں امیدیں دفن کر دیں کلیمؔ میں نے درونِ سینہ
خدا کرے وہ بھی ٹوٹ جائیں جو رہ گئیں ہیں کسی بہانے

دسمبر ۴۹ء ۶۰

مختصر سا دلِ پُر شوق کا افسانہ ہے
آپ ہی شمع ہے اور آپ ہی پروانہ ہے
میرے دل کو کوئی الزام نہ دے ای ساقی
جانتا ہوں کہ یہ ٹوٹا ہُوا پیمانہ ہے
عرش ہو فرش ہو محشر ہو ازل ہو کہ ابد
بیخودی اپنی جہاں ہو وہی میخانہ ہے

آدمیّت کا تقاضہ ہے کہ لے ضبط سے کام
ورنہ فطرت میں ہر اک آدمی دیوانہ ہے

دسمبر ۴۹ ء۶۰

حدِ فنا و بقا پر ہے اختیار مجھے !
ابھی ہوائے دو عالم ہے سازگار مجھے
اُنہیں کو گلشن فردوس میں بنالوں گا
ملے ہیں آتشِ دوزخ سے جو شرار مجھے
الٰہی کون سی دُنیا میں لا کے چھوڑ دیا
جہاں نہیں ہے کچھ اپنا بھی اعتبار مجھے
سکوں نصیب ہوں پھر بھی سکوں نصیب نہیں
قرار میں بھی ہے اندیشۂ قرار مجھے
وُہ تیرے جلوۂ خود بیں کے نذر ہو کے رہا
دیا گیا تھا ازل میں جو اختیار مجھے
شگفتہ پھول ہوں ایسا کہ لے اُڑی نہ کہیں
ہوائے شوق میں آ کر مری بہار مجھے
یہ میری قیدِ تعیّن یہ میری آزادی
مِلا ہے جبر کے سائے میں اختیار مجھے

کہیں ہُوں عشق سراپا کہیں ہُوں حُسنِ تمام
بنا کے چھوڑ دیا اپنی یادگار مجھے

تجلّیات کی دُنیا میں اور ہوش کلیمؔ!
کرم ہے اُس کا جو رکھتا ہے ہوشیار مجھے

۱۹۴۵ء

○

صیّاد کا قصور نہ میرا قصور ہے
اک دانۂ ہوس نے گرفتار کر دیا
اُمّید و بیم کی یہ کشاکش نہ پُوچھیے
جینا بھی چار روز کا دشوار کر دیا

زاہد کا زعمِ باطل، عاقل کی ہوشمندی
دونوں کی رہگذر میں حائل ہے خود پسندی

ہاں سہل تر ہے زاہد قدسی صفات ہونا
لیکن ہے کارِ مشکل طرزِ نیاز مندی

اپنے دماغ و دل سے کچھ کام لے جہاں میں
وہم و گماں کی جس سے ٹوٹے طلسم بندی

تُو ہے کہ اپنی دُھن میں آسودہ ہو رہا ہے
اب کس نظر سے دیکھے تجھ کو تری بلندی

باتیں کلیمؔ کی کچھ اِس طرز کی ہیں جیسے
کارِ زیاں طلب میں اُمیدِ سُود مندی

۱۲ فروری ۴۴ء

برنگِ روح ہر موجِ محبّت ہے جہاں میں ہُوں
بہُت گہرا مذاقِ حسُنِ فطرت ہے جہاں میں ہُوں
ذرا کہدو خرد کی گتھّیاں سُلجھانے والوں سے
وہاں عقل و خرد کا نام غفلت ہی جہاں میں ہُوں

مجھے جب میرا عرفاں ہی نہیں تو غیر کیا جانے؟
مرا ہونا کرامت ہی کرامت ہی جہاں میں ہُوں
حجاب اُٹھّے ہوئے ہیں سامنے وُہ جلوہ فرما ہیں
یہ ہستی اب طلسمِ بے حقیقت ہی جہاں میں ہُوں

غم و رنج و الم کی کیفیت کا پوچھنا ہی کیا؟
وہاں ٹوٹے دلوں کی قدر و قیمت ہی جہاں میں ہُوں
وہاں تو ایک ہی انداز ہے ہر لحظہ جلوؤں کا
وہاں یکساں فضائے نُور و ظلمت ہے جہاں میں ہُوں

سُرور و کیف میں ڈوبی ہوئی ہے زندگی میری
کلیمؔ اِک اِک نفس اِک ایک جنّت ہے جہاں میں ہُوں

۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء

اہلِ نظر ہیں آج اسی اشتباہ میں
وہ خود نگاہ میں ہیں کہ جلوے نگاہ میں

کیوں کر سما سکیں گے ہر اک کی نگاہ میں
یعنی ہزار جلوے ہیں اک لا الٰہ میں

اک موجِ سلسبیل ہے اک آتش خموش
وہ شورشیں ہیں جذب مری اشک و آہ میں

اے آفتابِ حشر نہ یوں مسکرا کے دیکھ
یہ دیکھ آج کون ہے کس کی نگاہ میں

رحمت کو مل گیا ہے بہانہ نجات کا
مجبوریوں کو دیکھ کے فردِ گناہ میں

ہستی کو پائدار سمجھ کر چلے تھے ہم
یہ کیا خبر تھی موت کا دھوکا ہے راہ میں

کہنا میرا سلام انہیں بھی نسیم صبح
اہلِ وطن ملیں جو کہیں تجھ کو راہ میں

انسانیت کا راز اسی میں ہے اے کلیم
دنیا کی ہر نگاہ کو رکھنا نگاہ میں

نزدیک تر کہاں سے ہے منزل کہاں سے دُور
یہ بات ہے ابھی نگہِ کارواں سے دُور

دونوں کے ربط و ضبط میں ہی آرزوئے زیست
ہم اِس جہاں سے دُور نہ ہم اُس جہاں سے دُور

شاید اِسے بھی تنکوں پہ کچھ پیار آگیا
بجلی گری ہے کیوں یہ مرے آشیاں سے دُور؟

ہاں اے سروشِ شوق ذرا زور سے پکار
واماندہ رہ نہ جائے کوئی کارواں سے دُور

یہ سرگزشتِ زخمِ جگر ہے کہ اے کلیمؔ!
کچھ پھول کھل رہے ہیں بہار و خزاں سے دُور

۱۹۸۱۰ء

چشمِ ظاہر بند کر لیں دیدۂ دل وا کریں
یُوں اگر دیکھیں تجھے تو عمر بھر دیکھا کریں

گُل کو ہنسنے دیجیے، شبنم کو رونے دیجیے
اپنی فطرت سے یہ ہیں مجبُور، آخر کیا کریں

کیا یہ کارِ لازمی تھا لالہ و گُل کیلئے؟
رنگ و بُو پھیلا کے دنیا میں اُنھیں رسوا کریں

عشق کی ناکامیوں نے کر دیا ہے بے نیاز
اے دلِ غم آشنا اب کیوں غمِ فردا کریں

طُور کے جلوے خود آئیں پائے بوسی کیلئے
اے کلیمؔ اتنی تو شانِ عبدیت پیدا کریں

۱۹۸۱ء

ہستی سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں
یہ خوابِ عینِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

اے عشق، دیکھنا وُہ مری زندگی نہ ہو!
جس پر گمانِ خواب کئے جا رہا ہوں میں

ہُوں زندگی کیساتھ مگر زندگی سے دُور
اِک یہ بھی انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

پستی میں ہُوں مگر ہیں نگاہیں مری بلند
ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

مَوجوں کے ساتھ ساتھ گذرتی ہے زندگی
ساحل سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

یہ بھی تو ایک مصلحتِ خاص ہے کلیمؔ
خُود کو اگر خراب کئے جا رہا ہوں میں

۲۰ر جنوری ۴۰ ۶۰

اک اک نفس پہ آہ کیئے جا رہا ہوں میں
جینا اگر یہی ہے، جیئے جا رہا ہوں میں
کیا اور اک خاطرِ مجبور کر سکے
جو آپ کہہ رہے ہیں کیئے جا رہا ہوں میں
لایا تھا ساتھ ساتھ غمِ جاوداں مجھے
اب غم کو اپنے ساتھ لیئے جا رہا ہوں میں
جب سے ہوا ہوں راہِ محبت سے آشنا!
پائے طلب کو تیز کیئے جا رہا ہوں میں

اے طورِ حُسنِ یار تجھے آخری سلام
جلوے بقدرِ ہوش لیے جا رہا ہوں میں

فروری ۴۰ء ۶۰

سوز ہی سوز بھر دیا غم کدۂ حیات میں
کتنے شرار تھے نہاں جلوۂ التفات میں

جلوے لئے ہوئے ہُوں میں عالمِ بے ثبات میں
میری تجلیاں ہیں گم میری صفات و ذات میں

راہِ طلب کی گردشیں دیر و حرم کی ٹھوکریں
مجھ کو ملی یہ نعمتیں کشمکشِ حیات میں

یاس کا نام ہے اُمید موت کا نام زندگی
درس یہی تو ہی مرے تذکرۂ حیات میں

علم نہیں تو جہل ہی ہست نہیں تو بود ہی
کچھ نہیں پھر بھی کچھ تو ہوں دیدۂ کائنات میں

موجۂ سوز و ساز ہے تیری بھی زندگی کلیمؔ
تو بھی ہے اک یادگار طُور کے واقعات میں

مئی ۱۹۴۰ء

"متاعِ کلیم"

مطمئن کچھ اپنے دل کو بھی بنا سکتا ہوں میں
زندگی سے زندگی کا راز پا سکتا ہوں میں
رازہائے عشق کیا ہیں رازہائے حسن کیا؟
آپ کو جب پردۂ دل میں چھپا سکتا ہوں میں
آفتوں سے کم نہیں ہوتا مرا جذبِ یقیں!
موت کے منھ میں بھی رہ کر مسکرا سکتا ہوں میں
کس طرف اب جا رہا ہے کاروانِ زندگی
ہو کچھ اندازہ تو اندازہ لگا سکتا ہوں میں

عزم و استقلال ہے قائم تو پھر کیا ہے کلیمؔ
جس قدر ہوں مشکلیں آساں بنا سکتا ہوں میں

مئی ۴۰ء

لطفِ سرور میں نہیں کیفِ بہار میں نہیں
جب سے وہ زندہ دل مرا میرے کنار میں نہیں

آپ کے گوش و ہوش تو میرے لئے ہیں بیقرار
مانا کہ دردِ دل ابھی میری پکار میں نہیں

مثلِ حیات دہر میں خود ہی ابھر کے بیٹھ جا
قدرِ وفا شعار کی شورشِ کار میں نہیں

میرا عدم وجود ہے میرا وجود ہے عدم
گاہ شمار میں ہوں میں، گاہ شمار میں نہیں

جون ۴۰ء ۶۰

دُور سے منظرِ فطرت کا نظارہ کرنا
حُسن کو حُسن کے انداز سے دیکھا کرنا
مُسکراتی ہوئی کلیاں ہوں کہ ہنستے ہوئے پھول
حیرتی بن کے ترے حُسن کو دیکھا کرنا
کچھ خبر بھی ہے تجھے او دلِ احساس طلب
زندگی نام اِسی کا ہے کہ تڑپا کرنا
خام کارانِ محبّت کیلئے مشکل ہے
آرزوئے غمِ جاں کاہ کا پیدا کرنا
کہیں تارے ہوں کہیں چاند کہیں سورج ہو
یوُں مُزیّن دلِ پُر شوق کی دنیا کرنا

کوئی مشکل ہی نہیں حوصلۂ دل کیلئے
اپنی دانست میں امروز کا فردا کرنا

جون ۳۰ ۶۰

رگ رگ حیاتِ ذوقِ نظارہ سے بھر گئی
دیکھا کیے اُنہیں کو جہاں تک نظر گئی
پھر ہے تلاش اُس نگہِ التفات کی
جو مرکزِ حیات سے آگاہ کر گئی
اُس زندگی کے حال پہ آنسو بہایئے
آئی تھی جو اثر کو، لئے بے اثر گئی!

خلوت میں آہِ نیم شبی کا اثر نہ پوچھ
ظالم تعیّنات کی حد سے گذر گئی

۶۰۔۱۹۴۰

مجھ کو مجاز کا نہ حقیقت کا ہوش تھا
کچھ جوش تھا تو عشقِ محبت کا جوش تھا

مے تھی، نہ میکدہ، نہ کوئی مے فروش تھا
ہم تھے جہاں، وہ عالمِ کیفِ خموش تھا

اس میکدے سے آئے ہیں مخمور ہو کے ہم
جس میکدے کی ہمکو خبر تھی نہ ہوش تھا

دیکھا تو کچھ یہ دیکھا تری جلوہ گاہ میں
جلوہ مری نگاہ کا خود پردہ پوش تھا

لپٹی ہوئی تھیں دل سے تمنائیں سیکڑوں
ہنگامہ جذبِ شوق کا محشر خروش تھا

جب منزلِ حیات پہ ڈالی گئی نظر
حیرت زدہ تھا وہ بھی جو تسکیں بدوش تھا

کیا بیخودی پہ تو نے قناعت نہ کی کلیمؔ
کیا جلوہ ہائے یار سے پیمانِ ہوش تھا

کیوں نہ غمِ حیات سے مقصدِ سوز و ساز لُوں
نالہ بھی دلخراش لُوں، آہ بھی دل گداز لُوں
فیصلۂ حیات میں کس نے یہ مجھ سے کہہ دیا؟
ذوقِ سرِ خودی نہ لُوں، ذوقِ سرِ نیاز لُوں
کاش حواس و ہوش کو فرصتِ بیخودی ملے
کاش شکستہ دل سے کچھ درسِ فنا نواز لُوں
جانے وہ کیا تھے مشغلے ناز و نیازِ عشق کے
سطوتِ غزنوی کہے، بندگیٔ ایاز لُوں

میں وہ کلیمؔ ہی نہیں جس پہ ہوں جلوہ زیرِ یاں
کیوں نہ بجائے طور میں راہِ درِ حجاز لُوں

۶۰۱۹۴۰

حجاباتِ من و تو کو اٹھا کر سرخرو ہو جا
وہ تیرے رُوبرو ہوں گے تو اُن کے رُوبرو ہو جا
کلی سے پھول ہو جا، پھول سے صد رنگ و بُو ہو جا
مگر یہ کب کہا تھا ہر کسی کی آرزو ہو جا
یہ کیا سرمستیاں اے شاہدِ رنگیں کے دیوانے
بہارِ میکدہ بن، جلوۂ جام و سبو ہو جا

زبانِ دل سے باتیں کر رہا ہوں کیف و مستی میں
ذرا، اے ہوشِ فطرت اور بھی کچھ دُور تو ہو جا

۶۰۱۹۴۰

کیا کہیں تجھ سے نگاہِ جلوۂ جانانہ ہم
ہو رہے ہیں سوز و سازِ عشق سے بیگانہ ہم

ہیں یہی دو باب، بس زیبِ کتابِ زندگی
ایک افسانہ وہ خود ہیں، دوسرا افسانہ ہم

ایک حالت پر نہیں رہتا مزاجِ آب و گل
ہیں کہیں شعلہ، کہیں شبنم، کہیں پروانہ ہم

ایک گوشہ میں ازل ہے ایک گوشے میں ابد
اس قدر رکھتے ہیں ساقی وسعتِ پیمانہ ہم

ہم کو جلنا ہے تو جل جائیں گے اپنی آگ میں
کیوں بنیں منت پذیرِ آتشِ بیگانہ ہم

مل گیا ہے طور کے شعلوں سے درسِ زندگی
بن گئے ہیں اے کلیم اک برقِ بیتابانہ ہم

۶۰۱۹۴۰

رہِ عاشقی میں نہ کچھ کام آئی | یہ کعبہ پرستی، یہ دیر آشنائی
رہا فلسفی دامِ عقل و خرد میں | مجھے لے اڑی میرے دل کی صفائی
ملی تازگی رفتہ رفتہ چمن کو | بہار آئی اور موج در موج آئی
مرے عشق کا مشغلہ بن چکی ہے | ترے شوخ جلووں کی بے اعتنائی
تو بے لوث راہِ جہاں سے گذر جا | یہی زہد ہے اور یہی پارسائی
یہ مہرِ درخشاں یہ روشن ستارے | ترے در پہ کرتے رہے جبہہ سائی

کلیم آب و گِل کی حقیقت ہی کیا ہے
مگر اِن میں ہے جوہرِ کبریائی

۱۹۴۰ء

خلش دل کی نشاطِ دل کا ساماں ہوتی جاتی ہے
سُرور و کیف بن بن کر نمایاں ہوتی جاتی ہے

محبّت ہے کہ تسکینِ دل و جاں ہوتی جاتی ہے
جسے میں کُفر سمجھا تھا وُہ ایماں ہوتی جاتی ہے

مری خاموش آہوں نے اثر اتنا تو دِکھلایا!
کہ دل کی ہر کرن شمعِ شبستاں ہوتی جاتی ہے

گلستاں کی حقیقت باغباں بیچارہ کیا جانے؟
یہ کس گُل کی مہک رازِ گلستاں ہوتی جاتی ہے

ستارے رات کے، دن کی تجلّی، شام کی سُرخی
اِنہیں جلوؤں سے روشن بزمِ امکاں ہوتی جاتی ہے

زمانہ بھی زمانے سے ہُوا جاتا ہے بیگانہ
حقیقت بھی حقیقت سے گریزاں ہوتی جاتی ہے

کلیمؔ آسانیاں خود پرورش پاتی ہیں مشکل میں
اُسے مشکل نہیں کہتے جو آساں ہوتی جاتی ہے

فروری ۱۹۳۹ء

رازو نیازِ حُسنِ چمن آشکار دیکھ
ہر گُل کے زیر سایہ پنپتا ہے خار دیکھ

اک موج تھی کہ جانِ چمن بن کے رہ گئی
کِتنی لطیف تر ہے نسیمِ بہار دیکھ

شاید وہ تیرے پہلو سے آواز دے تجھے
کوئی تری سُنے نہ سُنے، تو پکار دیکھ

آ تو گیا ہے اس چمنِ روزگار میں
دو دن کی زندگی ہے یہاں بھی گذار دیکھ

دُنیا بھی ایک عرصۂ محشر سے کم نہیں
سب اپنی اپنی دھن میں ہیں مصروفِ کار دیکھ

سجدے تری جبیں میں ہوں بیتاب اگر کلیمؔ
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ!

تری نظروں کی جُنبش کا لیا دل نے اثر برسوں
رہی اِس لطف سے دُنیائے دل زیر و زبر برسوں
جہاں آسودگی پاتا رہا ذوقِ نظر برسوں
اُسی آئینہ میں دیکھا ہے تجھ کو جلوہ گر برسوں

پرائی آگ کا احساں اُٹھاتا کون جلنے میں
مری غیرت نے خود پیدا کیئے دل میں شرر برسوں
میں اپنی زندگی کو بھی نہ اب تک زندگی سمجھا
رہا اس بے خبر دُنیا میں آ کر بے خبر برسوں

وہ کون ایسا تھا جو دار و رسن کا مستحق ٹھہرا
کلیمؔ اللہ والوں میں رہا یہ شور و شر برسوں

۱۹۳۹ء

عرش بھی ہے نگاہ میں، فرش بھی ہے نگاہ میں
کون سی شئے ہے جو نہیں فکر و نظر کی راہ میں
آتشِ سوزِ عشق ہے شعلۂ برقِ طور ہے
اِس کے سوا ہے اور کیا حُسن کی جلوہ گاہ میں
لختِ دل و جگر بھی ہیں آہوں کے ساتھ کیا؟
ذرّے سے کچھ چمکتے ہیں موجۂ دُودِ آہ میں

جس کی نہ کوئی ابتدا جس کی نہ کوئی انتہا
ایسے بھی کچھ مقام ہیں رہگذرِ نگاہ میں

۶۰۱۹۳۹

بجا کہ دل ایک آئینہ ہے، یہ آئینہ خوش خصال بھی ہے
اسی ہیں دیکھ اپنی زندگی کو کہ اِس میں ماضی بھی حال بھی ہے

کبھی ہے یہ عرش کا ستارہ، کبھی ہے پستی کی وادیوں میں
بشر کی فطرت میں ابتدا سے عروج بھی ہے زوال بھی ہے

جہانِ فکر و نظر کا عالم عجیب عالم ہے زندگی میں!
کہ محویت بھی ہے، ہوش بھی ہے، شعور بھی ہے خیال بھی ہے

نہ پوچھ اے ہمنشیں تو مجھ سے غمِ محبّت کا نفع و نقصاں
اگر یہ ہے سہل اوّل اوّل، تو آخر آخر محال بھی ہے

گُل اور غنچوں کا ذکر ہی کیا یہاں تو کانٹے بھی ہنس رہے ہیں
یہ دیکھنا ہے کہ اس چمن میں کسی کو فکرِ مآل بھی ہے

کلیمؔ اپنے دماغ و دل کو تو اپنی ہستی سے دور رکھئے!
جو سرحدوں میں خیال کی ہے وہ ماورائے خیال بھی ہے

۶۱۹۳۹

وہ کیوں نہ ہستئ پرایدؔست اپنی ناز کرے
جسے خدا شرفِ غم سے سرفراز کرے
بشر جہاں میں وہ پیدا اسرِ نیاز کرے
کہ آستانِ محبّت بھی جس پہ ناز کرے
کبھی کے کھو چکے اسکو تو ہم محبّت میں
کہاں وہ دل ہے جو احساسِ سوز و ساز کرے
میں اس نظر کے تصدق میں اُس نظر کے نثار
جو بے نیاز رہے، اور بے نیاز کرے
تری نظر کی حقیقت کو جانتا ہوں میں
جسے یہ چاہے دو عالم میں سرفراز کرے

جو اپنے حال سے واقف نہ ہو جہاں میں کلیمؔ
وہ کیا مجاز و حقیقت میں امتیاز کرے

۶۰۱۹۳۹

آؤ ہم تم مل کے کرلیں ختم بابِ زندگی
نامکمل کیوں رہے شرحِ کتابِ زندگی

اپنے مرکز پر ملا کرتا ہے ہر شے کو سکوں
لے چلا کس سمت تو اے اضطرابِ زندگی

یہ حیاتِ جاوداں کو بھی سمجھتا ہی فریب
کس قدر مایوس ہی ناکامیابِ زندگی

ہے تمہارے قرب میں بھی دوریوں کی اک جھلک
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا عذابِ زندگی!

یہ فنا کی کشمکش اور یہ بقا کی کوششیں
بارہا بن کر بگڑتا ہی حبابِ زندگی

اہلِ دل بھی بیخبر ہیں اہلِ عرفاں بھی خموش
کس سے پوچھا جائے اب رازِ حجابِ زندگی

ایک شورش ہے بپا کون و مکاں میں اے کلیم
کس نے یہ بے وقت چھیڑا ہی ربابِ زندگی

۱۹۳۹ء

۱۵۸

"متاعِ کلیم"

حُسن کی کیفیتوں کو جذبِ جاں کرتے رہے
روح کو مسرور دل کو شادماں کرتے رہے

غنچہ و گل کو نہ میرے دل سے نسبت دیجئے
یہ وُہ ہیں جو آپ کی رُسوائیاں کرتے رہے

خاک ہونے تک نہ نکلی ایک آہِ سرد بھی
مُدّتوں اندازۂ سوزِ نہاں کرتے رہے

کون سمجھے تیرے دیوانوں کی طرزِ گفتگو
داستانِ راز حرفوں میں بیاں کرتے رہے

زخمِ دل تازہ بتازہ حُسنِ رنگیں نو بہ نو
ہم اِن آئینوں میں سیرِ دو جہاں کرتے رہے

بدگمانی بھی محبّت میں عجب شئے ہے کلیم
اپنے دل کی آپ ہی بربادیاں کرتے رہے

دسمبر ۳۹ء